تواریخِ کلیسیا

کا

مُجمّل بیان

مُصنّفہ

مِس ڈورتھیا جین اسٹیفن صاحبہ

مُترجمہ

مسٹر اصغر فضل آلٰہی پال

ایس۔ پی۔ سی۔ کے

انار کلی۔ لاہور

۱۹۶۰

اوّل

تعداد ۱۲۰۰

قولُ المسیح

"اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع سے میرے ساتھ ہو"

یوحنا ۱۵: ۲۷

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے"

یوحنا ۱۶: ۱۲

"پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ"

متی ۲۸: ۱۹

"اور دیکھو میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں"

متی ۲۸: ۲۰

پیش لفظ

وہ مضمون جس سے مَیں اپنے کالج کے ایام میں بے حد نفرت کرتا تھا تواریخ کا مضمون تھا۔ یعنی ہر قسم کی تواریخ۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ وہ طریقِ تعلیم تھا جس سے مجھے پہلے پہل یہ مضمون پڑھایا گیا۔ ہمیں بادشاہوں کی تاریخیں، لڑائیاں اور جنگوں کے نام، معاہداتِ صلح کے فقرات اور نامعلوم اشخاص کے نام حفظ کرنے پڑتے تھے۔ بعد ازاں جب مَیں نے تواریخِ کلیسیا کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے پھر اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے تواریخ کی کتابیں، تاریخوں، بدعتوں اور کونسلوں کے تذکروں سے بھری ہوئی نظر آئیں۔ میرا خیال ہے کہ اس غلط طریقِ تعلیم کا مَیں ہی واحد طور سے شکار نہیں ہُوں بلکہ غالباً اور اصحاب بھی میری طرح ہیں۔

مِس ڈور تھیا جین اشلیفن کو فنِ تعلیم میں درجۂ کمال کی اہلیت حاصل ہے۔ آپ کی پیشوائی میں تواریخِ کلیسیا کا مطالعہ کرنا خوشی اور تخلیقی تحریک حاصل کرنا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے آپ کے رنگدار نقشوں سے واضح کردہ لیکچروں کو سنا ہے اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ نے کلیسیا کی ترقی اور تحریک موجودہ مشنوں کے

مسائل اور کلیسیا جامع کے از سر نو اتحاد کرنے کے موضوع پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں آپ کے ۵ لیکچر قلمبند ہیں جو آپ نے غیر منقسم ہندوستان کے مختلف طرح کے سامعین۔ مثلاً اینگلیکن۔ غیر اینگلیکن، ہندوستانی اور مغربی لوگوں کے روبرو دئے تھے۔

اب آپ اپنی مشنری خدمات کو پورا کر کے ہندوستان سے تشریف لے گئی ہیں۔ لیکن آپ کی یہ کتاب ہندوستانی کلیسیا کے لئے آپ کی الوداعی کے تحفوں میں سے ایک تحفہ ہے۔ میں بڑی خوشی سے اس تحفے کو ہندو پاک اور غیر ممالک کے مسیحی کارندوں کے سپرد کرتا ہوں۔

وی۔ایس۔ ڈوزنیکل

مندرجات

OUTLINE HISTORY OF THE CHRISTIAN CHURCH

BY

DORTHEA JANE STEPHEN

S. TH

تواریخِ کلیسیا کا مُجمل بیان



ایس۔ پی۔ سی۔ کے

انارکلی۔ لاہور

بار اول

تعداد ۱۰۰۰

پہلا باب

خُداوند یسُوع مسیح کی آمد کی تیّاری

مسیحی کلیسیا کی ابتدا ملک فلسطین کے شہر یروشلم میں ہُوئی۔ اس ملک اور اس کے عظیم الشان شہر کا محلِ وقوع یسعیاہ[1] نبی کے الفاظ میں قلمبند ہے۔ یہی وُہ مقام ہے جہاں سے سچّے مذہب کی روشنی اور حرارت بہترین طریق سے ساری دُنیا کے کونے کونے تک پہنچ سکتی تھی۔

ابتدائی اوقات ہی سے فلسطین ایشیا، افریقہ اور یورپ کا مقامِ اتصال بنا رہا ہے۔ وُہ مقامات جو اب شمالی افریقہ، عربستان اور وسط ایشیا کے صحرا نظر آتے ہیں، کسی زمانے میں زرخیز چراگاہیں تھیں جہاں غیر مذہب لوگ شکار کھیلا کرتے تھے اور مویشی پالا کرتے تھے۔ زمانہ بعید میں ہماری دُنیا کی آب و ہوا میں کچھ ایسی تبدیلی پیدا ہُوئی کہ یہ جگہیں آہستہ آہستہ خشک ہوتی چلی گئیں۔ بالآخر اس جغرافیائی تبدیلی کا یہ نتیجہ نکلا کہ جو انسان اور حیوان ان علاقوں میں پائے جاتے تھے وُہ دریائے نیل کی طرف اور میسوپوتامیہ اور سندھ کی وادیوں کی طرف نقل مکان کر گئے۔ ان لوگوں نے جو اُن وادیوں میں بستے تھے ایک دُوسرے کے ساتھ سلسلۂ تجارت شروع کر دیا۔ وُہ بڑی بڑی شاہراہیں جو اُن مقامات کو آپس میں ملاتی تھیں۔ بحیرۂ رُوم کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں اور ان نیچی پہاڑیوں کے دامن سے گُزرتی تھیں۔ بعد ازاں

---

[1] یسعیاہ ۲۹:۱

اسی مقام پر اسرائیلیوں نے سکونت اختیار کی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً چھ سو سال قبل از مسیح عوام الناس نے تہذیب و تمدن کو قبول کیا۔ اس زمانہ سے زمانہ حال تک یعنی تین صدیوں میں مذکورہ ممالک میں اور مشرقِ بعید کے ملک چین میں کئی قسم کی تہذیبیں بامِ عروج پر چڑھیں اور بعد ازاں اُن پر زوال آیا۔

یہودی تہذیب:-

عہدِ عتیق کی تاریخ تقریباً ۲۱۰۰ قبل از مسیح حضرت ابراہیم کی کہانی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ کہانی اس امر کو واضح کرتی ہے کہ عبرانی مذہب نے کس طرح نشوونما پائی۔ یہ مذہب پہلے پہل اُن مذاہب کی طرح ہی تھا جو اس مذہب کے قرب وجوار میں پائے جاتے تھے لیکن جُوں جُوں زمانہ بدلتا گیا یہ مذہب اپنی نوعیت میں بالکل جدا نظر آنے لگا۔

یہودی خیال کے مطابق خُدا پاک ایک زندہ شخصیت ہے۔ ہم اس کی ذات کے متعلق سچا علم حاصل کر سکتے ہیں چاہے کہ ہمارا علم اس کے متعلق تھوڑے سے تھوڑا ہی ہو۔ ہم اس کے ذاتی علم کو نہ رسُوم سے اور نہ ہی عمیق خیالات سے حاصل کرتے ہیں بلکہ اس کا سچا گیان محض نیک زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ رسم و رسُوم کا مجرد علم ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا اور بہت تھوڑے لوگ فلسفیانہ خیالات کے بحرِ بے کراں میں غوطہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس نیک زندگی بسر کرنے سے ہر ایک شخص خُدا کی قُربت کو حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کر سکتا ہے۔

بنی اسرائیل کو یہ نقطہ سمجھنے میں ایک طویل عرصہ لگا اور اس عرصہ میں اُنہوں

نے کئی بار ایسا محسوس کیا کہ اس سے قبل کہ وہ اس سبق کو سیکھیں یا تو یہ مذہب خود بخود ختم ہو جائے گا یا اُن کی قوم ہی فنا ہو جائے گی۔ سن ۷۲۲ قبل از مسیح میں ایک اسوری بادشاہ نے سامریہ پر قبضہ کر لیا اور بہت سے لوگوں کو زنجیر در سن کر کے اپنے ساتھ لے گیا اور ملک میں بارہ قبیلوں میں سے صرف دو قبیلوں کو چھوڑا۔ سنہ ۵۱ء میں ایک اور اسوری بادشاہ نے یروشلم پر حملہ کر کے اپنے ہمراہ سب کچھ لے گیا۔ سنہ ۵۹۷ء میں ایک اسوری بادشاہ اس پر قابض ہُوا اور سنہ ۵۸۶ء میں وہاں کے باشندوں کو غلام بنا کر بابل میں لے گیا اور یروشلم کی ہیکل کو جلا دیا۔ ان حالات میں کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ مذہب باطنی خرابیوں اور بد اخلاقیوں کے باعث دم گھٹ کر مر جائیگا۔ مثلاً جب لوگ بُت پرستی میں پھنس گئے اور اُنہوں نے انبیاء کی تعلیم کو سننے سے انکار کر دیا یا جب بابل کی اسیری کے بعد سلسلہ نبوت ختم ہُوا اور شریعت ایک کڑی روایت کی شکل اختیار کر گئی "تو تم اُسے پھر باپ یا ماں کی کچھ مدد کرنے نہیں دیتے" (مرقس ۷: ۱۲)

لیکن ان تمام ناموافق حالات اور ان حالات کے بدترین تجربات کے باوجود بنی اسرائیل میں ایک قسم کا مذہب پیدا ہُوا جو دُنیائے عالم کی کسی بھی قوم کے پاس نہیں پایا جاتا تھا۔ مختلف وقتوں میں کئی دفعہ اس مذہب کو چالڈیہ (CHALDEA) مصر، اسیریا، فارس اور یونان کے مذاہب سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلی صدی قبل از مسیح میں اس مذہب کو رومی مذہب سے بھی ملنے کا اتفاق ہُوا۔

رومی مذہب :-

شہر رُوما کی بنیاد آٹھویں صدی قبل از مسیح میں رکھی گئی تھی۔ یہ وہ وقت

تھا جبکہ عاموس بنی اسرائیل کو پیغام دے رہا تھا۔ تیسری صدی کے اوائل حصہ میں رُوما اطالیہ کا سب سے مقدم شہر تھا۔ تیسری صدی میں رُوما نے یونان کو فتح کیا۔ پہلے پہل اس کی قوت کی دھاک مشرقی ممالک میں پھیلی اور ایشیائے کوچک اور مصر نے اس کے اثرات کو محسوس کیا۔ اس کی سیاسی قوت کے ساتھ ساتھ اس کا مذہبی تصور بھی چاروں اطراف میں پھیلنا شروع ہو گیا۔

رُوما کے مذہبی خیالات بہت گہرے نہیں تھے۔ اس کی ابتدا بعینہٖ ویسی ہے جو ہمیں برما، چین اور چند دیگر ممالک کے مذاہب میں نظر آتی ہے۔ رُومی نکتہ نظر سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دُنیا میں ایسی ایسی ارواح پائی جاتی ہیں جو انسانی زندگی، پیدائش، شادی، موت، ہل جوتنے اور بیج بونے وغیرہ کے ہر ایک فعل کی محافظ ہیں۔ ان ارواح کے رُوبرو دُعائیں کی جاتی تھیں اور قربانیاں دی جاتی تھیں۔ اس مذہب کا تعلق خاندان اور کھیتی باڑی کے ساتھ تھا جُوں جُوں رُومیوں کی سیاسی قوت پھیلتی گئی توں توں اُن کے مذہبی خیالات اور سیاسی اقتدار بڑھتے چلے گئے حتٰے کہ اُن کا مذہب ایک شہر کا مذہب بن گیا۔ رُومیوں کے ہاں شہریت کے فرائض کا بہت زیادہ احساس تھا۔ وُہ سلطنت جس کی بُنیاد رُومیوں نے رکھی تاریخ عالم میں سب سے زبردست سلطنت بن گئی جس کا دُنیا عالم میں کوئی ثانی نظر نہیں آتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہُودیہ رُومی اُمورِ سلطنت کے اثرات سے متاثر ہو گیا۔

یہُودیہ رُومی سلطنت میں شامل ہو گیا

اسیری کے بعد یہُودیہ کی سرزمین شاہان فارس کی محکوم ہو گئی۔ اس کے

بعد وہ اُن یونانیوں کے قبضہ میں آ گئی جو مصر میں حکومت کرتے تھے بعد ازاں وہ دیگر یونانیوں کی محکوم ہوگئی جو انطاکیہ میں حکمران تھے ۔ مکابیوں کے ایک خاندان نے جو پہلے پہل وطن پرست قائد تھے لیکن آخر کار وہ ظالم بن گئے تھے ، یہودیہ کو ان کے پنجہ سے چھڑایا تھا ۔ اُنہوں نے نصف لوگوں کو بغاوت کرنے پر آمادہ کر دیا اور باقی نصف لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ۔ یہ دونوں جماعتیں بعد ازاں فریسی اور صدوقی کہلائیں ۔ اُدوم کے ایک متموّل سردار بنام ہیرودیس نے میکابیوں کے آخری شہزادوں پر تسلط جمایا اور اُن کے خاندان کی آخری شہزادی سے شادی کر لی ۔ لڑائیوں اور خانگی جنگوں کے باعث ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور آخر کار ایک جماعت نے رُومی جنرل پومپی (POMPEY) سے درخواست کی کہ وہ ملک کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے ۔ چنانچہ پومپی یروشلم کی طرف بڑھا اور ۶۳ قبل از مسیح میں اُسے فتح کیا ۔ اس کے بعد رُومی امن کا دَور شروع ہوا جو چار صدیوں تک جاری رہا ۔ رُومی حکومت کے ساتھ امن وامان ، نظم ونسق اور آزادی حکومت کے تمام ممالک میں آگئی ۔ عام طور پر حکومت کے حدود اربعہ میں کوئی جنگ نہیں لڑی گئی اور عوام کے لئے سفر کرنا پہلے سے بہت آسان ہوگیا ۔ رُومی منصف عام طور پر عادل تھے اور اگرچہ رُومی صوبیدار لوگوں پر ظلم وستم ڈھاتے تھے تاہم عوام کو اُن کے خلاف اپیل کرنے کی اجازت تھی ۔

یُونانی مذہب :-

اہل رُوم نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی لیکن یُونانیوں نے اُنہیں حکومت کرنا سکھایا ۔ یُونانی مذہب کے مسلمات کے مطابق ہر شہر کا اپنا اپنا دیوتا یا دیوی تھی ۔ ان دیوی دیوتاؤں کا تعلق عام طور پر فطرت کی قوتوں سے تھا مثلاً سورج

یا سمندر یا بالیدگی حاصل کرتا ہُوا اناج کا پودا۔ بعض اوقات ان دیوی دیوتاؤں کو شہروں کے بانی اور محافظ خیال کیا گیا ہے۔ یہ تصوّر اس قوم کے لئے کافی تھا جو صرف سیاسی طبیعت رکھتی تھی لیکن یہ تصوّر فلسفیوں کے لئے کافی نہ تھا جو ظاہری دُنیا کے پیچھے حقیقت کی کھوج میں لگے ہوئے تھے۔ اُن کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جو محض اس دُنیا کو بہتر بنانے کے خیال سے مطمئن نہ تھے بلکہ وُہ چاہتے تھے کہ ایک نئی زندگی حاصل کریں جو اس مادی دُنیا ہی کی نہ ہو بلکہ اس سے بلند درجہ کی ہو۔

انسانی طبیعت کے اس تقاضا کو پُورا کرنے کی غرض سے رُوما، سیریا، ایشیائے کوچک اور یُونان میں ایسے ایسے مذاہب پیدا ہو گئے جنہیں مسٹری ریلیجنز کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ مذاہب اپنے پیروؤں کو ایک قسم کی نئی زندگی، کی دیوتا سے شرکت و وصال، جسمانی زندگی میں تجلیّات اور موت کے بعد ابدی زندگی کے حصُول کے لئے مدعو کرتے ہیں۔ اُن مذاہب میں سے ہر مذہب میں شامل ہونے کے لئے ایک باضابطہ شرکت کی رسم ادا کی جاتی ہے اور ان سب میں اشتراکت، موت اور قیامت کے موضُوعات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خیال ایک مسٹری یا بھید کے رنگ میں غالباً ڈرامائی کرداری کے رُوپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہر خیال کا دار و مدار کوئی قصہ یا روایت ہے جس کا تعلق موسموں سے، سُورج کی روشنی کے طلُوع اور غرُوب ہونے یا فصلوں کے لڑنے یا نئے طور سے بالیدگی پانے سے ہے لیکن ان کا تعلق کسی تواریخی حقیقت سے وابستہ نہیں ہے۔ ان مذاہب میں سب سے مشہُور مذہب متھرا[1] کا مذہب ہے۔ متھرا اس سُورج دیوتا کا ایک رُوپ ہے۔ یہ

---

[1] THE MYSTERY RELEGION کے MITHRAS

مذہب سپاہیوں کے ہاں مقبولِ عام تھا۔

پہلی صدی قبل از مسیح میں یہودی مذہب ۔

(الف) ممسوح[1] یا المسیح۔

تمام مذکورہ مذاہب نے کسی حد تک سلطنت رُوما کے باشندوں کی تسلّی وتشفّی کردی تھی لیکن یہودیوں کو ان سے تسلّی نہ ہوئی۔ ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اُن کا وجُود عوام وخواص کے لئے نفرت انگیز اور مخاصمانہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودی لوگ ان خیالات کو جنہیں عوام مانتے تھے قبول نہیں کرتے تھے۔ عوام کے خیالات کو قبُول کرنا اُن کے لئے مشکل تھا۔ مسیح سے قبل آخری دو صدیوں میں یہودیوں نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس وقت اُن کی شاہی حکومت کو زوال آچکا تھا اور اُن کی قدیم اُمیدیں کہ وہ سیاسی شان وشوکت حاصل کریں گے مٹی میں مل گئی تھیں اور اب وہ کسی اور قسم کے جلال کے منتظر تھے۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جب موجُودہ خراب اور بُری دُنیا کا خاتمہ ہوگا تو زندگی کا کوئی نیا دَور شروع ہوگا۔ وہ ایک نجات دہندہ کی آمد کے منتظر تھے جو نہ صرف ایک دُنیوی بادشاہ ہوگا بلکہ وہ آسمان کی طرف سے نجات دہندہ مقرر ہوکر آئیگا۔ اس اُمید کا اظہار اپیوکلپٹکس[2] کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں سے ایک کا نام حنوک[3] کی کتاب ہے جس کا تذکرہ یہوداہ میں کیا گیا ہے۔

(ب) حیاتِ جاودانی[4]۔

اہلِ یہود کو ایک نئی اُمید نے مسرور ومنور کیا۔ اُنہیں یہ اُمید تھی کہ خدا جن

---

1. THE MESSIAH 2. APOCALYPTIC BOOKS 3. ENOCH
4. IMMORTALITY

انسانوں کو پیار کرتا ہے وہ موت کے وقت فنا نہیں ہوں گے بلکہ وہ ابدی زندگی میں داخل ہوں گے۔ عہدِ عتیق کے قدیم ترین حصص میں اس اعتقاد کا کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ زبور ۳۰ آیت ۹ میں مرقوم ہے۔

"جب میں گور میں جاؤں تو میری موت سے کیا فائدہ؟
کیا خاک تیری ستائش کریگی؟ کیا وہ تیری سچائی کو بیان کریگی؟"

زبور ۸۸ کی آیات ۱۰ اور ۱۱ میں مرقوم ہے:-

"کیا وہ جو مر گئے ہیں اُٹھکر تیری تعریف کریں گے؟ کیا تیری شفقت کا چرچا گور میں ہوگا یا تیری وفاداری کا جہنم میں؟"

یسعیاہ باب ۳۸ کی آیت ۱۸ میں حزقی ایل بادشاہ اپنی بیماری سے شفا حاصل کرنے کے بعد کہتا ہے:-

"اس لئے کہ پاتال تیری ستائش نہیں کرسکتا اور موت سے تیری حمد نہیں ہوسکتی۔ وہ جو گور میں اُترنے والے ہیں تیری سچائی کے اُمیدوار نہیں ہوسکتے"

یہ اُمید صاف و صریح الفاظ میں زبور ۷۳ کی چھبیسویں[۲۶] آیت میں نظر آتی ہے:-

"گو میرا جسم اور میرا دل زائل ہوجائیں، تو بھی خدا ہمیشہ میرے دل کی قوت اور بخرہ ہے"

اس مقام پر خدا سے تعلق رکھنا اس اُمید کا دار و مدار ہے۔ یہ اُمید دھندلی سی صورت میں دیگر زبوروں میں دکھائی دیتی ہے (ملاحظہ ہو ۱۶: ۱۰) ہمیں یہ اُمید دانی ایل نبی کی کتاب کے بارھویں[۱۲] باب کی دوسری آیت میں نظر آتی ہے۔

"اور جو خاک میں سو رہے ہیں اُن میں سے بہتیرے جاگ اُٹھیں گے بعض حیاتِ ابدی کے لئے اور بعض رسوائی اور ذلتِ ابدی کے لئے"

ہمیں یہ اُمید دُوسری صدی قبل از مسیح کی اپوکریفا کی کُتب میں نظر آتی ہے
"راستبازوں کی رُوحیں خُدا کے ہاتھ میں ہیں" (حکمت ۳:۱)

۲-مکابیوں باب ۷ میں ایک ماں کے سات بیٹوں کی کہانی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ قتل کر دیئے گئے تھے کیونکہ وہ ناپاک کھانے سے انکار کرتے ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے موت کو قبول کرتے ہیں اور اس طرح وہ کسی مستقبل کی قیامت کا اعلان کرتے ہیں:-

"دُنیا کا بادشاہ ہمیں جو اُس کی شریعت کے لئے مرے ہیں زندگی کی ابدی تجدید کے لئے زندہ کھڑا کرے گا۔"

پھر ۲-مکابیوں باب ۱۲ میں چند آدمیوں کی کہانی بیان کی گئی ہے جو جنگ میں مارے گئے تھے اور وہ اپنے کپڑوں کے نیچے مشرکین کے تعویذ گنڈے اور جادو منتر پہنے ہُوئے تھے۔ یہوداہ مکابیس نے فوج سے چندہ جمع کیا تاکہ اُن آدمیوں کے لئے گناہ کا[۱] فدیہ پیش کیا جا سکے۔ ان کہانیوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کی آمد سے قبل اس موضوع پر کسی حد تک یہودی تصور موجود تھا۔

"خُدائے واحد قادرِ مطلق کا ظہور ہر زمانے میں نیک دل لوگوں پر ہوتا رہا۔"

(سکندریہ کے کلیمنٹ کا قول، دُوسری صدی بعد از مسیح، ملاحظہ ہو باب ۳)

---

[۱] SIN OFFERING.

دُوسرا باب

خُداوند یسُوع مسیح کی خدمت

اس کتاب کے شروع میں انجیل مقدس کی چار آیات لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین آیات ہمارے سامنے تین باتوں یا کاموں کو پیش کرتی ہیں جو کلیسیا کو اُس کے ابتدائی مرحلہ میں درپیش تھے اور جو ابھی تک اُسے سرانجام دینے ہیں یعنی گواہی دینا، سیکھنا اور سکھانا۔ چوتھا کام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ وہ کونسی بات ہے جو واحد طور پر ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم ان آیات کو پورا کریں۔

عقیدہ قیامتِ مسیح :-

خُداوند مسیح کی خدمت غالباً دو سال اور چھ ماہ تک جاری رہی۔ تقریباً ۲۷ سنہ عیسوی سے ۳۰ سنہ عیسوی تک خُداوند مسیح نے مسیح موعُود ہونے کا دعویٰ کیا جس کے منتظر اہلِ یہُود تھے۔ اُنہوں نے اس دعوئی کو رد کر دیا اور رُومی حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اُسے صلیب پر چڑھائے۔ خُداوند مسیح کی موت کے بعد مسیحی کلیسیا بہت جلدی وجُود میں آئی۔ اس کی بُنیاد قیامتِ مسیح کے عقیدہ پر قائم تھی۔ اس وقت کلیسیا یروشلم میں ایک سو بیس افراد کے ایک گروہ پر مشتمل تھی۔ (اعمال ۱: ۱۵) ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کلیسیا کے دیگر افراد گلیل

میں تھے۔ مُقدس پولُس رسُول انجیل میں خُداوند مسیح کے ظہُور کے پانچ صد گواہوں کا ذکر کرتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ۱ کرنتھیوں ۱۵: ۶) وُہ خُداوند یسُوع کے متعلق ایمان رکھتے تھے کہ وُہ اُن کا آقا و مالک ہے۔ تاہم اُنہوں نے خُداوند یسُوع کے متعلق اپنے مُعتقدات کو کسی لفظی صورت یا عقیدہ کی صورت میں بیان نہیں کیا تھا۔ اُن میں سے بعض لوگوں کے پاس غالباً اُس کی تعلیم کی مختصر تحریری یادداشتیں تھیں یا یوں کہیں کہ وُہ لوگ اس تعلیم کے حصص کی منہ زبانی تلاوت کر سکتے تھے۔ بعض لوگوں کو اس کے متعلق خاص خاص کہانیوں کا علم تھا اور سب کے سب لوگوں کو اُس کی خدمت کا ضرور علم تھا۔ اُن کا ایمان تھا کہ وُہ مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے اور آسمان کی طرف صعُود فرما گیا ہے اور اُس نے اپنے رُوح کو بھیجا ہے کہ اُن کے ساتھ رہے اور اس رُوح کے وسیلہ سے وُہ سچے طور سے اُن کے درمیان موجُود ہے۔ وُہ لوگ اس امر کے منتظر تھے کہ وُہ فتح و نصرت کے ساتھ واپس لوٹے گا اور زمین پر اپنی بادشاہت کو قائم کرے گا۔ اُن کے اعتقاد کی مرکزی بات اور اُن کی تبلیغ کا خاص الخاص موضُوعِ بحث قیامتِ مُردگان پر تھا۔

دیگر بانیانِ مذاہب:-

یہ باتیں مسیحیت کے سوا دُوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتیں کیسی مذہب میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ ایک رُستم اپنی مہم سے واپس لوٹے گا تا کہ وُہ اپنے لوگوں کی مدد کرے جبکہ وُہ اپنی ضرُوریات کے محتاج ہوں گے کیسی مذہب میں یہ تصوّر بھی نظر آتا ہے کہ ایک دیوتا مر جاتا ہے اور پھر اپنی فصلوں کے ساتھ دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ ان مذاہب کے اعتقادات اس نوعیت

کے نہیں ہیں جو خداوند مسیح کے حواری اس کے متعلق تصور کیا کرتے تھے ۔
مسیحیت کے علاوہ دیگر مذاہب کا تاریخی سراغ محض اُن کے بانیوں تک پہنچتا
ہے جنہوں نے اُن مذاہب کو جاری کیا تھا ۔ نیز ہر مذہب میں بانی مذہب کی
موت کا بیان درج ہے مثلاً زرتشت جو ایرانی نبی کے لقب سے ملقب ہے
جنگ میں مرا تھا ۔ بدھ جی مہاراج بعارضہ اسہال ملک عدم کو چل بسے تھے ۔
بدھ جی کے سر پیر کو ایک شاندار رسم کے ساتھ جلا دیا گیا تھا اور اس کی خاک کو اس
کے شاگردوں میں بانٹ دیا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ کسی بھی کتاب میں یہ ذکر نہیں پایا
جاتا کہ ان اُستادوں میں سے ایک بھی شخص مُردوں میں سے زندہ ہُوا تھا۔ قیامت
کا یہ نرالا دعویٰ محض خداوند مسیح کے حق ہی میں کیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ مسیحیت کی تعلیم
کا مرکزی ستون ہے ۔ دیگر مذاہب میں مذہب کا مرکزی نکتہ بانیانِ مذہب
کی تعلیم ہے لیکن مسیحیت میں واحد طور پر مرکزی نکتہ قیامتِ مسیح ہے۔ خداوند
یسوع مسیح کی تعلیم پہاڑی وعظ میں یا آپ کے دیگر خطبات یا تمثیلات ثانوی
حیثیت رکھتی ہیں (ملاحظہ ہو اعمال ۲ : ۳۲ و ۳ : ۱۵ وغیرہ) کلام اللہ میں
پہلے پہل اس واقعہ کا محض اعلان کیا جاتا ہے ۔ اس کی تفسیر جو رسولوں کے
خطوط میں مندرج ہے زیادہ تر بیس سال کے عرصہ کے بعد ضابطہ تحریر میں
آئی تھی ۔ اگر ہم اس نکتہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو ہم مذہب کے اصل و اصول
اور مقاصد و معانی کو نہیں جانتے ۔ اس کے برعکس اگر ہم اس حقیقت کو سمجھتے
ہیں تو وہ اخلاقی تعلیم جس کے کئی نکات دیگر مذاہب سے اتفاق رکھتے ہیں ،
ایک جدید موافقت سے ایک نیا متحرک بن کر ہمارے دلوں میں اُترتی ہے ۔ اس
سے ایک نئی روشنی نکل کر اخلاقیات ، علم طبعیات اور بنی نوع انسان کی تاریخ پر
پڑتی ہے جس کی معاونت سے ہم ان مضامین کی ماہیت کو پہلے کی نسبت زیادہ

اچھی طرح جاننے لگتے ہیں۔ یہ بیس صدیاں جو خداوند مسیح کی تاریخی زندگی کے بعد گزری ہیں انہوں نے ان حقائق کے متعلق ہماری عقل وفہم کو اور گہرا کیا ہے لیکن ان حقائق کو تبدیل نہیں کیا۔

ابتدائی کلیسیا

کلیسیا کی ابتدائی عمر اس پشت تک ہی تھی جس نے بنا مسیح کو بقید حیات دیکھا تھا۔ ہمارے لئے یہ تصور کرنا آسان ہے کہ یہ پشت مُقدس پطرس اور مقدس پولس کی موت تک زندہ تھی۔ ۶۵ عیسوی تک یعنی پینتیس سال کے عرصہ تک بحیرہ روم کے اردگرد مسیحی کلیسیائیں سکندریہ کے روما اور شائد ہسپانیہ تک پائی جاتی تھیں (ملاحظہ ہو رومیوں ۱۵: ۲۴) مشرق میں رومی سلطنت کے باہر بھی کلیسیائیں پائی جاتی تھیں لیکن ہمیں ان کے متعلق بہت کم علم ہے کیونکہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان کلیسیاؤں کے حالات قلمبند کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی دوسرا مُقدس لوقا نہ تھا۔ اگر کوئی ایسا مورخ ہوتا تو ہمیں یہ علم حاصل ہو جاتا کہ کیا واقعی مُقدس تھوما رسول گنڈوفارس کی سلطنت میں جو خلیج کچھ میں واقع تھی داخل ہوا تھا۔ نیز ہمیں یہ بھی علم حاصل ہو جاتا کہ واقعی تھوما رسول نے یا سکندریہ کے سوداگران نے جنوبی ہند کی کلیسیا کا سنگ بُنیاد رکھا تھا۔ اس کلیسیا نے ایک سو پچاس سال کے بعد سکندریہ کی کلیسیا کو لکھا تھا کہ اُن کا کوئی سربراہ اُن کی کلیسیا کا معائنہ کرے۔ ہمارے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ واقعی مذکورہ بالا ہندوستان یہی ہندوستان تھا جسے ہم ہندوستان کہتے ہیں یا یہ مقام بحیرہ عرب کے ساحل کا ایک حصہ تھا۔ یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ۶۵ء تک دنیائے عالم

کو بشارت دینے کا کام بڑے احسن طریق سے شروع کیا گیا تھا۔

گواہی کا کام :-

خُداوند یسُوع مسیح کے لئے گواہی دینے کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ خُداوند مسیح کے رسُولوں نے اور مُقدّس استفنس شہید نے یروشلم میں اپنے ایمان کا بیان پیش کیا تھا (ملاحظہ ہو اعمال ۴ : ۳۰-۳۲ و ۷ : ۵۶) بعینہٖ مُقدّس پولُس رسُول نے یروشلم سے رُوما تک متعدد مقامات میں اپنی گواہی پیش کی تھی۔ (ملاحظہ فرمائیں اعمال ۱۳ : ۴۰ و ۷ : ۳۰، ۳۱ وغیرہ) فیستس صُوبیدار نے پولُس کی تعلیم کا خلاصہ ذیل کے الفاظ میں پیش کیا ہے :-

"کسی شخص یسُوع کی بابت . . . . . . جو مر گیا تھا اور پولُس اس کو زندہ بتاتا ہے" (ملاحظہ ہو اعمال ۲۵ : ۱۹)

بعض اوقات گواہی دیتے دیتے موت واقع ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات اُنہیں قید خانے کی ہوا کھانی پڑتی تھی۔ تاہم بعض اوقات یہ دونوں باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اہل یہود مسیحیوں کو ایذائیں دیتے تھے لیکن ان کے پاس اتنا اختیار و اقتدار نہ تھا کہ زیادہ نقصان پہنچاتے۔ حکومت کی طرف سے بھی ایذا رسانی ۶۴ سنہ عیسوی سے قبل واقع نہ ہوئی تھی۔

نیرو کی ایذا رسانی ۶۴ سنہ ء

اس سال رُوما میں ایک زبردست آگ لگ گئی اور شہنشاہ نیرو نے جس کا دماغی توازن اس حد تک خراب ہو چکا تھا کہ کثیر التعداد لوگوں کی یہ رائے تھی کہ وُہ مخبوط الحواس ہے۔ مسیحیوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے یہ آگ لگائی ہے۔

وُہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی شخص پر اس آگ کا الزام تھوپا جائے۔ چونکہ مسیحی لوگوں کی ایک گمنام جماعت تھی اس لئے وُہ اپنی صفائی پیش کر کے اپنے آپ کو نہ بچا سکے۔ متعدد مسیحیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں موت کے گھاٹ اُتار اگیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض مسیحیوں کو (شہنشاہ نیرو کے باغ میں ایک دعوت کے دوران میں) زندہ جلایا گیا تاکہ وہ مشعلوں کی طرح جل کر باغ کو روشن کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کے بعد ہی مُقدّس پولُس اور مُقدّس پطرس کو بھی جامِ شہادت پلایا گیا۔ اس واقعہ سے کلیسیا کے ابتدائی دور کا اختتام ہوتا ہے۔

مُقدّس مرقس کی انجیل ۶۵ء

مُقدّس پطرس تو جامِ شہادت پی چکے تھے لیکن اُن کا رفیق مرقس ابھی تک زندہ تھا اور مرقس نے ایسا کام سرانجام دیا جو اس سے قبل کسی نے اتنے مکمل طور سے نہ کیا تھا۔ یہ کام بے حد ضروری ثابت ہُوا۔ اُس نے مُقدّس پطرس کی تعلیم کو سپردِ قرطاس کیا اور اُسے کتابی شکل دی۔ ہمیں یہ بات ایک مصنف بنام یُوسیبیئس (EUSEBIUS) سے معلوم ہوتی ہے۔ اس شخص نے ۳۲۵ عیسوی میں کلیسیا کی ایک تاریخ لکھی تھی جس میں وہ اپنے سے قبل کے ایک مصنف پپیاس (POPIAS) کا اقتباس کرتا ہے جس نے ۱۳۵ء اور ۱۶۵ء کے درمیانی سالوں میں اپنی کتاب لکھی تھی۔ پپیاس رقمطراز ہے:۔

"مرقس کی کتاب ہماری سب سے پہلی انجیل ہے۔ اس سے قبل مسیح کے فرمانوں کا مجموعہ لکھا جا چکا ہے۔ متعدد لوگوں نے کسی نہ کسی نوعیت کے واقعات کو جو ظہور پذیر ہوئے تھے لکھا تھا (ملاحظہ ہو لوقا ۱:۱)

اغلباً لُوقا نے بذاتِ خُود جبکہ وُہ مُقدّس پولُس کے ہمراہ قیصریہ میں

تھا اپنی اس کتاب کے حصص کو تحریر کیا تھا لیکن یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرقس کی انجیل وہ پہلی انجیل ہے جس کے پس منظر ایک رسول کی سند پائی جاتی ہے۔ یہ انجیل مقدس پطرس کی موت کے بعد اور یروشلم کے زوال کے بعد سترویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس نے اس تعلق کو منقطع کر دیا جس سے مسیحی کلیسیا یہودی مذہب سے وابستہ تھی۔

مُقدّس لُوقا اور مُقدّس متّی کی اناجیل:-

اس کے بعد کے بیس سالوں کے عرصہ میں سنہ ۸۰ء تا ۸۵ء میں دیگر دو سینا پٹک (SYNOPTIC) اناجیل ضبط تحریر میں آئیں۔ ان تینوں انجیلوں میں سے ہر ایک ربنا المسیح کی کہانی کو اپنے کسی خاص نقطۂ نظر سے پیش کرتے اپنے سامعین کے لئے جو رومی، یونانی اور یہودی تھے بیان کرتی ہے اور یوں خداوند کی شبیہ مبارک کو بحیثیت ابن اللہ، ابن آدم اور ربنا المسیح کے جو مصلوب ہوا اور زندہ ہوا پیش کرتی ہے۔

ایذا رسانی:-

مذکورہ بالا صدی کے آخری دس سالوں میں ایک اور ایذا رسانی کا حکم شہنشاہ دومتین نے دیا۔ اُسے مسیحیوں سے خطرہ محسوس ہونے لگا کیونکہ وہ اس کے علاوہ ایک اور بادشاہ کو مانتے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ مسیحی لوگ بیک وقت دو بادشاہوں کے لئے وفادار نہیں رہ سکتے۔ مکاشفہ کی کتاب اس ایذا رسانی کی توضیح اور خداوند مسیح کی آمد ثانی کی ایک جان بخش اُمید میں لکھی

---

۵ (DOMITANS PERSECUTION A.D 96.)

گئی تھی جس کے لئے مسیحی لوگ عرصہ دراز سے منتظر تھے۔

مقدس یوحنا کی انجیل سنہ ۹۰ تا ۱۰۰ء

ہم صحیح طور سے یہ نہیں بتا سکتے کہ مقدس یوحنا کی انجیل کب وجود میں آئی۔ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ انجیل سنہ ۱۱۰ء سے قبل نہیں لکھی گئی تھی۔ بعض علما کا یہ خیال ہے کہ یہ سنہ ۱۰۰ء میں لکھی گئی تھی۔ حال ہی میں چند علما نے کہا ہے کہ یہ تقریباً سنہ ۹۰ء میں لکھی گئی تھی۔ ہم یہ بھی صحیح طور سے نہیں بتا سکتے کہ یہ انجیل کس شخص نے لکھی تھی "یوحنا" وہ رسول ہو سکتا ہے جو زبدی کا بیٹا تھا یا یہ شخص اس کا شاگرد تھا یا ممکن ہے وہ کوئی اور شخص تھا صاحب معروف کوئی بھی کیوں نہ ہو یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ وہ خلوص دل سے مستعد تھا اور اسے اپنی قابلیت کا احساس تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اسے خدا کی طرف سے بلاہٹ ہے کہ وہ خدا کے اختیار سے کلام کرے۔ اس نے اپنے زمانے کی تشویشات کو تحریر کیا۔ یہی تشویشات دیگر زمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لوگ پوچھتے تھے کہ خداوند مسیح ابھی تک کیوں نہیں آیا اور اس نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ مسیح آچکا ہے اور اب بھی وہ ان کے ساتھ ہے۔ (یوحنا ۱۴: ۱۸، ۲۳) لوگ شکایت کرتے تھے کہ خدا نے دنیا کا انصاف نہیں کیا کیونکہ بدکردار لوگ ابھی تک خوشحال ہیں اور راستباز لوگ دکھ سہہ رہے ہیں۔ یوحنا نے اس شکایت کا یہ جواب دیا کہ خداوند مسیح کی آمد کا مفہوم عدالت ہے مسیح نور تھا اور جنہوں نے اس نور کو قبول نہیں کیا ان پر سزا کا حکم ہو چکا (ملاحظہ ہو یوحنا ۳: ۱۸-۱۹، ۵: ۲۵، ۶: ۴۷) لوگ کہتے تھے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ خداوند مسیح جس میں

الوہیت بھی دُکھ سہے اور مر جائے۔ اگر خداوند یسوعؑ واقعی نجات دہندہ اور ابن اللہ ہے جیساکہ اُن کا ایمان تھا تو پھر وُہ ایک انسان نہیں ہو سکتا اُسکی انسانیت ایک نقاب تھی۔ مقدس یوحنّا نے اس مجمل بیان کی بنا پر خداوند مسیح کی فطرت کے جواز میں جواب دیا تھا کہ وُہ خدا اور انسان تھا "وہ کلام مجسم ہُوا" (یوحنّا ۱: ۱۴) اس کی کتاب کے تمام اوراق میں چند الفاظ بار بار نظر آتے ہیں مثلاً نور۔ زندگی۔ محبت۔ عدالت۔ گواہی اور وُہ اپنی کتاب کے اہم مرکزی حصّہ کو اُن لوگوں کی مبارکبادی سے جو اُس پر بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں ختم کرتا ہے۔ (یوحنّا ۲۰: ۲۹)۔ اس کے بعد ایک تتمہ ہے جو اس تنبیہ سے ختم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کو یہ فکر نہیں کرنا چاہیئے کہ وُہ اس خیال کی تہ تک معلوم کریں کہ اس دُنیا کا خاتمہ کب ہوگا۔ اس طرح سے مُقدّس یوحنّا کلیسیا کو چشم دیدہ گواہان کے دَور سے اُن گواہان کے دور تک راہ دکھاتا ہے جنہوں نے مسیح کو اپنی جسمانی آنکھوں سے نہیں بلکہ رُوح کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

"اب اَے بھائیو! میں تمہیں خوشخبری بتائے دیتا ہُوں جو پہلے دے چکا ہُوں جسے تم نے قبول بھی کر لیا تھا اور جس پر قائم بھی ہو۔۔۔۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے تم کو وُہی بات پہنچا دی جو مجھے پہنچی تھی کہ مسیح کتاب مقدّس کے مطابق ہمارے گناہوں کے لئے مُوا اور دفن ہُوا اور تیسرے دن کتاب مقدّس کے مطابق جی اُٹھا"

(مُقدّس پولُس منقول از اکرنتھیوں ۱۵: ۱ تا ۴۔ یہ خط تقریباً ۵۵ء میں لکھا گیا)

نوٹ:۔ یہ امر تسلیم کیا گیا ہے کہ ما بعد کے حصّہ کی تمام تاریخات سن عیسوی کی ہیں۔

تیسرا باب

دوسری اور تیسری صدیاں

حکومت اور کلیسیا

رومی حکومت اعلیٰ سے کلیسیا کی محافظ ثابت ہوئی اور کلیسیا کو ایک منظم مجلس سے سرفراز کیا جس میں کلیسیا نے پہلے پہل اپنی تحریک کو شروع کیا تھا۔ اگر ہم کسی ایسے نقشہ پر نگاہ ڈالیں جو رومی سلطنت کے حدود اربعہ کو پیش کرتا ہو تو ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ رومی سلطنت ایک باغ کے مشابہ تھی جس کی چاروں اطراف پر ایک باڑ تھی۔ اس میں کلیسیا نے طفولیت کی حالت میں چلنا پھرنا سیکھا تھا۔ سلطنت کے حد فاصل آبنائے جبرالٹر (STRAIT OF GIBRALTER) سے شروع ہو کر بحر الکاہل کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی برطانیہ کے شمال تک نکل گئی تھی اور پھر مشرق کی سمت میں دریائے رائن (RHINE) اور دریائے ڈینوب (DENUBE) کے کناروں کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی چلی گئی تھی۔ پھر یہ جنوب کی سمت میں مڑ گئی تھی اور یوں ایشیائے کوچک اور فلسطین کو اپنی حدود میں شامل کر لیا تھا۔ پھر یہ حد آبنائے جبرالٹر تک واپس آ گئی تھی۔ تیس سال سے زائد عرصہ تک ہم نے دیکھا ہے کہ رومی حکومت کو کلیسیا کے وجود کی بہت کم خبر تھی اور جب حکومت کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے

کلیسیا کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ رُومی بادشاہ ہر نوعیت کے تعلقات اور راہ و رسم کو جو اُن کے احکام کے تحت نہ تھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک رُومی شہر میں یہ بھی ممنوع تھا کہ لوگ اپنے آپ کو آتش گارڈ (FIRE GUARD) میں تنظیم کریں۔ اوّلین درجہ سلطنت کا تھا لیکن مسیحی لوگ سلطنت کی زندگی سے علیحدہ رہے۔ وُہ بُت خانوں (TEMPLES) میں نہیں جاتے تھے۔ وُہ شہنشاہِ رُوم کے مجسّمہ کے سامنے، جو کہ سلطنت کا زندہ نشان تھا، خوشبو جلانے سے انکار کرتے تھے۔ وُہ لوگ اچھے خاصے شہری، ایماندار جفاکش اور عقلمند تھے۔ شہنشاہ کو یہ علم تھا کہ مسیح کے لئے اُن کی وفاداری شہنشاہِ رُوم کی وفاداری سے زیادہ تھی۔

رائے عامہ اور کلیسیا۔

رُومی عوام اور حکام دونوں مسیحیوں کے خلاف تھے۔ اُنہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ مسیحیت کا کیا مفہوم ہے یا کلیسیائی عبادتوں میں کیا کُچھ ہوتا ہے وُہ جانتے تھے کہ مسیحی لوگ عموماً رات کے وقت تخلیہ میں جمع ہوتے تھے اور ایک دُوسرے سے محبت کرتے تھے اور سب مِلکر ایک کھانے میں شرکت کرتے تھے۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وُہ اس موقع پر گوشت کھاتے ہیں اور خُون پیتے ہیں۔ ان حالات میں یہ تصور کرنا آسان تھا کہ یہ گوشت اور خُون مقتول بچوں کا تھا اور وُہ محبت جو ان لوگوں میں پائی جاتی تھی خلاف قانون شہوانی خواہش تھی۔ علاوہ ازیں مندروں کے پجاری اور نوکر چاکر مسیحیوں سے بے حد نفرت کیا کرتے تھے کیونکہ اُنہیں یہ معلوم تھا کہ مندروں میں عابدین کا شمار گھٹتا جا رہا تھا اور قربانی کے جانوروں کی تجارت گر رہی تھی۔

پلنیؔ[1] کا مکتوب ۱۱۲ء

۱۱۲ء میں پلنی بتونیہ کے صوبیدار (بتونیہ بحرِ اسود کے کنارے واقع ہے) نے شہنشاہ ٹروجن[2] کو ایک مکتوب لکھا اور اُسے بتایا کہ وہ مسیحیوں کے متعلق تحقیقات کر رہا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مسیحیوں کے متعلق اب باطل اور بداخلاق کہانیاں سراسر جھوٹی ہیں۔ تاہم یہ بات سچی ہے کہ اُنہوں نے شہنشاہِ رُوم کے مجسمہ کی عبادت کرنے سے انکار کیا تھا۔ شہنشاہ ٹروجن نے پلنی کو تحریر کیا کہ وہ اس معاملہ میں مسیحیوں کا تعاقب نہ کرے لیکن اگر وہ اُس کے سامنے پیش کئے جائیں اور شہنشاہ کی عبادت سے انکار کرنے کے جرم میں مرتکب ہوں تو انہیں لازماً سزا موت دی جائے۔ یہ سزا انہیں اُن کے عقائد کے لئے نہیں بلکہ اُن کی نافرمانبرداری کے لئے دینی چاہیئے۔ یہ خطوط جو پلنی اور ٹراجن کے مابین تحریر کئے گئے تقریباً سب سے پہلا حوالہ ہے جو ہمیں کلیسیا کے متعلق کلیسیا کے باہر سے دستیاب ہوتا ہے۔

اگنیشیس[3] اور پولیکارپ:

مذکورہ بالا واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۱۵ء میں خاص خاص مسیحیوں کو رُومی مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہونے کے لئے بلایا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ شہنشاہِ روم کے مجسمہ کے سامنے خوشبو میں جلائیں۔ بہت سے مسیحیوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور اُن کے بشپ اگنیشیس (IGNATIUS) کو رُوم کی طرف روانہ کر دیا۔ رُومی تھیٹر میں

---

[1] PLINY [2] TROJAN [3] IGNATIUS AND POLYCARP.

جنگلی درندوں نے اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور کھا گئے۔ اس قسم کی سزائے موت عام طور پر مجرموں کو دی جاتی تھی اور عوام الناس کی تفریح طبع کے لئے اُسے ایک کھیل کی طرح دکھایا جاتا تھا۔ یہ دیوتاؤں کی علانیہ عبادت کا جُز تھا۔ بشپ اگنیشیس نے اپنے دوران سفر میں سات خطوط قلمبند کئے تھے۔ چند خطوط ان کلیسیاؤں کو لکھے گئے تھے جنھوں نے اپنے نمائندوں کو بھیجا تھا کہ وُہ راستہ میں اُس سے ملاقات کریں۔ ایک خط کلیسیا رُوم کے نام پر تھا اور اس ایما سے لکھا گیا تھا کہ اُس کے پہنچنے سے قبل یہ خط مذکورہ کلیسیا تک پہنچ جائے۔ ایک خط پولیکارپ، سمرنا کے بشپ کے نام پر تھا۔ جس کے پاس وُہ ایشیا چھوڑ کر یورپ جانے سے پہلے رہا تھا۔ وُہ خطوط اب ہمارے ہاتھ میں ہیں اور اس موضوع پر کافی روشنی ڈالتے ہیں کہ اُس زمانے میں ایشیا کی کلیسیا کی کیا حالت تھی۔ اُن خطوط سے ہمیں بہر حال اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ایشیا میں کلیسیا پر بشپ صاحبان حکومت کرتے تھے اور ہر ضلع کے لئے ایک بشپ ہوتا تھا۔ ہمیں اس بات کا بھی علم حاصل ہوتا ہے کہ اگنیشیس خود بشپوں کے اختیار و اقتدار کی تائید کرتا تھا، تاہم چند ایسے لوگ بھی تھے جنہیں یہ بات ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ ہمیں اس بات کا بھی علم حاصل ہوتا ہے کہ کس طرح اگنیشیس نے اپنی شہادت کی آمد کو اپنی زندگی کا سب سے عظیم الشان خوشی کا موقعہ منصور کیا۔ "اب" وُہ کہتا ہے "میں نے شاگرد بننا شروع کیا ہے"۔ پولیکارپ بھی، جو سمرنا میں اگنیشیس کا میزبان تھا عرصہ چالیس سال کے بعد (۱۵۵ء یا ۱۵۶ء میں) شہید کر دیا گیا۔ ان ایام میں وُہ ایک معمر انسان تھا اور جب صوبیدار نے اُس سے اس امر کا مطالبہ کیا کہ "وُہ اپنے سفید بالوں کی تعظیم کرے"!

اور مسیح کا انکار کر کے اپنی زندگی کو موت سے بچا لے تو اُس نے جواب میں کہا: ۔ "میں چھیاسی ۸۶ سالوں تک مسیح کا خادم رہا ہوں تو پھر میں کس طرح اپنے شہنشاہ کی جس نے مجھے نجات دی ہے، بے ادبی کر سکتا ہوں؟" ان حالات میں وہ لقمۂ اجل بنا۔

لائنس[1] کے شہداء ۱۷۷ء

۱۷۷ء میں لائنس میں جو ملک فرانس کا ایک بڑا شہر ہے ایذا رسانی شروع ہوئی۔ بے شمار مسیحیوں کو اکٹھا گرفتار کیا گیا۔ اُن میں ایک غلام لڑکی بنام بلانڈینا[2] بھی تھی۔ اُن میں دو اشخاص کے سر رومی شہری ہونے کی وجہ سے قلم کر دیئے گئے۔ دیگر کو کباب کی طرح بھونا گیا یا دست پناہ سے نوچا کھسوٹا گیا یا انہیں جنگلی درندے کھا گئے۔ بلانڈینا نے سب سے زیادہ روحانی و جسمانی اذیت برداشت کی اور دو تین روز تک زندہ رہی۔ اس عرصہ میں مجسٹریٹ نے لاحاصل کوشش کی اور زور دیا کہ وہ خداوند مسیح کا انکار کرے۔ اُس کا ایک بھائی جس کی عمر انیس ۱۹ سال کی تھی پہلے ہی روز چل بسا۔ جب جب بھی اُس کے ایمان کے متعلق استفسار کیا گیا تو وہ صرف یہ کہتا تھا۔

"میں ایک مسیحی ہوں۔"

کارتھیج[3] کے شہداء ۲۰۳ء

چند سالوں کے بعد تقریباً ۲۰۳ء میں ایک اور نوجوان دوشیزہ کو جس

1. MARTYRS OF LYONS 2. BLANDINA 3. MARTYRS OF CARTHAGE

کا نام پرپیتوا (PERPETUA) تھا اور وہ کارتھیج میں جو ملک افریقہ میں ہے رہتی تھی۔ اُسے چند دوستوں کے ہمراہ قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور اُس کا حسب و نسب اور تعلیم و تربیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اُس نے اپنی اور اپنے لوگوں کی قید کی داستان اور قید خانہ میں اپنے خوابوں کے احوال کو قلمبند کیا ہے۔

ملک افریقہ کے عظیم المرتبت اور سلطان القلم طرطلین (TURTULIAN) نے اس تحریر کے ساتھ اُن لوگوں کی اموات کے خونی حالات کو درج کر دیا ہے۔ یہ ساری داستانِ شہدا جو خون کے آنسوؤں سے لکھی گئی تھی سکندریہ کی کلیسیا کے سپرد کر دی گئی تھی اور یہاں اُسے حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ اس حفاظت کی وجہ سے وہ داستانِ شہدا ابھی تک ہمارے پاس موجود ہے۔ جن لوگوں نے ان مسیحیوں کو جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے دیکھا تھا اُن پر ایک بات کا بے حد اثر تھا اور وہ اُن کی دلیری اور خوشی تھی جس سے مسرور ہو کر اُن شہدا نے موت کو قبول کیا۔ اُن کی شہادت سے عام طور پر منکرینِ مسیحیت کی زندگیاں تبدیل ہو گئیں۔ تاہم بہت سے مدعیانِ مسیحیت اس امتحان کے میدان میں کھڑے نہ ہو سکے۔ انہوں نے یا تو شہنشاہِ روم کے مجسمہ کی پرستش کی جیسا کہ مجسٹریٹ نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ اُس کی تعمیل کریں یا انہوں نے رشوت دے کر یہ لکھوا دیا کہ انہوں نے شہنشاہ کے مجسمہ کی پرستش کی ہے جبکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا لیکن اُن مسیحیوں نے جو ایذا رسانی کے امتحان میں ثابت قدم رہے دلیری اور خوشی کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی یادگار ابھی تک صفحۂ ہستی سے معدوم نہیں ہوئی۔

سپرین[ف] ۲۴۸ء - ۲۵۸ء

سپرین ۲۴۸ء سے ۲۵۸ء تک کارتھیج کا بشپ تھا۔ چالیس سال کی عمر میں اس کی زندگی میں تبدیلی پیدا ہوئی تھی اور دو سال کے بعد کارتھیج کے لوگوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ وہ کارتھیج کے بشپ کی وفات کے بعد بشپی عہدہ پر معمور ہو۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایک جان گسل ایذا رسانی کی آگ بھڑک اُٹھی۔ کلیسیا کے لئے یہ بات ضروری تھی کہ وہ اپنے بشپ کو نہ کھو بیٹھے اور اپنے رہنما کے بغیر تن تنہا نہ رہ جائے۔ اس خیال کے پیش نظر سپرین روپوش ہو گیا لیکن وہ خط و کتابت کے وسیلے تمام حالات سے باخبر رہتا رہا۔ دو سال کے عرصہ کے بعد ایذا رسانی ختم ہو گئی اور وہ واپس کارتھیج کو لوٹ آیا۔ اگلے سال شہر میں پلیگ کی وبا پھیل گئی اور کارتھیج کے متعدد اُمرا نے بیماروں کی امداد کے لئے روپیہ دیا لیکن وہ خود وہاں سے نکل گئے اور دور دور مقامات میں چلے گئے۔ سپرین نے مسیحیوں کو اکٹھا کیا اور انہیں شہر کے تمام حصوں میں بھیجا کہ وہ بیماروں کی دیکھ بھال کریں اور مردوں کو دفن کریں۔ مسیحیوں کے اس فیاضانہ طرزِ عمل سے اہلِ شہر پر بے حد اثر ہوا اور اس غلط خیال کی تردید ہوئی کہ وہ بدکردار، غدار اور باغی ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوبارہ ایذا رسانی شروع ہو گئی۔ اس دفعہ سپرین نے روپوش ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ حراست میں لے لیا گیا اور اُس کی گردن اُڑا دی گئی۔ ایک جمِ غفیر اُس کی سزائے موت کو دیکھ رہا تھا۔ اس میں مسیحی لوگ بھی شامل تھے جو کمال احترام سے یہ دردانگیز نظارہ دیکھ رہے تھے۔ دیگر لوگوں کے دلوں

ف CYPRIAN

میں بھی سپرین کے لئے عزت واحترام کے جذبات تھے۔

ہم مقدس سپرین کے خیالات سے اچھی طرح آشنا ہیں کیونکہ وہ متواتر دیگر بشپ صاحبان اور علما کو مراسلات بھیجتا تھا اور ہمارے پاس اُس کے اور باقی بشپوں کے مراسلات موجود ہیں۔ عام طور پر سپرین کے مراسلات جو پوپ کے نام پر لکھے گئے تھے بطور اقتباس پیش کئے جاتے ہیں اور یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اُن ایام میں دیگر کلیسیاؤں نے کلیسیا رُوم کو کوئی خاص اختیار و اقتدار نہیں دے رکھا تھا۔ کلیسیا رُوم سب سے بڑی کلیسیاؤں میں سے ایک کلیسیا متصور کی جاتی تھی کیونکہ یہ سلطنت کے دارالحکومت کی کلیسیا تھی اور مقدس پطرس اس کلیسیا کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا ممکن ہے اُس کے ہاتھوں سے اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا ہو۔ یہ کلیسیا اربابِ عقل و دانش کی قوت و اقتدار اور مصیبت زدہ لوگوں کی امدادی سرگرمی کے سبب مشہور و معروف تھی۔

سکندریہ کے لوگ[1]

دوسری اور تیسری صدی میں ساری کلیسیا بشپوں کے ماتحت منظم کی گئی تھی۔ ہر ایک بشپ کا اپنا اپنا کلیسیائی حلقہ (DIOCESE) تھا جو ایک شہر یا اس سے زیادہ شہروں اور ان شہروں کے گرد اگرد کے دیہاتوں پر مشتمل تھا۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کلیسیا میں سب سے مایۂ ناز اور عالم فاضل لوگ پائے جاتے تھے جو بشپ نہیں تھے۔ ان میں سے تین آدمی خاص طور سے مقتدر حیثیت کے مالک تھے۔ وہ سکندریہ میں مقیم تھے اور اسی وجہ سے انہیں اسکندری یا سکندریہ کے رہنے والے کہا جاتا ہے۔ ان میں سے پہلے کا نام پنتنس (PANTÆNUS) تھا۔ سنہ ۱۸۰ء میں وہ اہلِ ہند کی دعوت کو قبول کر کے "ہندوستان" میں آیا تھا۔

---

[1] ALEXANDRIANS.

ان ایام میں لفظ "ہندوستان" کا استعمال غیر واضح طور سے کیا جاتا تھا ہم نہیں جانتے کہ وہ مذکورہ ملک کے کونسے حصّے میں گیا تھا ممکن ہے کہ وہ مالا بار کے ساحل پر آیا ہو یا ممکن ہے کہ وہ جنوبی عرب تان کے کسی ضلع میں گیا ہو۔ اس سفر سے واپس آکر اس نے اس سفر نامہ کو قلمبند کیا تھا جس کے چند حصص ابھی تک اقتباسات کی صورت میں دیگر کُتب میں موجود ہیں۔ اُس نے اس کے بعد سکندریہ میں ایک مسیحی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کے بعد اُس کا جانشین اسکندریہ کا ایک، دوسرا عظیم الشان باشندہ تھا جس کا نام کلیمنٹ (CLEMENT) تھا۔ کلیمنٹ کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ اُس نے یہ تعلیم دی کہ جس طرح اہل یہود کے مابین خُدا نے انبیا کی وساطت سے خُداوند یسُوع المسیح کے لئے ایک راہ تیار کیا تھا، اسی طرح خُدا نے اہل یونان کے مابین فلسفیوں کے وسیلے خداوند یسُوع المسیح کے لئے راہ تیار کیا ہے۔ مختلف مضامین پر اُسکی تعلیم وہی ہے جسے ہم موجودہ دور میں نئی تعلیم (MODERN) کے نام سے پکارتے ہیں مثلاً تعلیم النسواں کے موضوع پر اس کی تعلیم وغیرہ وغیرہ۔ اس مدرسے کا تیسرا جلیل القدر عالم اوریجن (ORIGEN) تھا جس کا عظیم ترین کارنامہ تیسری صدی کے ابتدائی سالوں کا ثمر ہے۔ یہ کتاب مقدس کے متن کا تحفظ ہے یعنی وہ اصلی عبرانی یا یونانی الفاظ جن میں کتاب مقدس کی کتابیں پہلے پہل ضابطہ تحریر میں آئیں۔

کتاب مقدس کا متن :-

جب کتاب مقدس کی کتابوں کے نسخے تیار کئے جاتے تھے تو اغلاط اور بھول چوک کا واقع ہونا لازمی تھا اس لئے یہ ضروری امر تھا کہ مختلف نسخوں کا

موزانہ کیا جائے اور ان کی تصحیح ہو۔ دُنیا کی کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے اصل
الفاظ کی حفاظت اتنی صحت کے ساتھ کی گئی ہو جتنی کہ عہد جدید کی گئی ہے۔
یہ کام خاص طور پر اوریجن کی محنتوں کا ثمرہ ہے جس نے مختلف کلیساؤں کی کتب
کے نسخوں کو جمع کیا، اُن کا موازنہ کیا اور اس کام کو اتنے اعلیٰ پیمانہ پر سرانجام
دیا کہ یہ بیش قیمت کلام بعد کے جہالت اور انتشار کے زمانوں میں بھی محفوظ رہا۔
یہ بات عہد عتیق کے متعلق بھی صادق ثابت ہوتی ہے۔ اس کام کا سہرا بھی
اوریجن کے سر پر ہے۔

تیسری صدی کا اختتام۔

اگرچہ کلیسیا کو کئی بار سلطنتِ رُوم کی حدود کے اندر اور باہر ظلم و تشدد
کا نشانہ بنایا گیا تاہم اس کا وجود ظالموں کے ہاتھ سے مٹ نہ سکا۔ اس کے
برعکس کلیسیا شمار اور علم و عرفان اور مسیحی زندگی کے تجربات میں ترقی کرتی چلی
گئی اسکے کارہائے نمایاں کی توقیر بہت سے دلوں میں پیدا ہو گئی، اگرچہ
رُوم کا شہنشاہ اس کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ یورپ میں کلیسیا سلطنت کی حدود
سے باہر پھیل گئی۔ فارس میں کلیسیا دریائے دجلہ اور فرات کی وادیوں
میں اور عربستان میں پھیل گئی۔ جیسا کہ ہم نے اس سے قبل ذکر کیا ہے کلیسیا
کا جانفزا پیغام اس ملک میں بھی پھیل گیا جسے آجکل ہندوستان کہا جاتا ہے۔

"انسانوں کو مسیحی بنایا جاتا ہے وہ پیدائشی مسیحی نہیں ہوتے"
(کارتھیج کے طرطلیان کا قول ۔ ۱۹۰ء)

"یہ ایک ممتاز امرتیت دلیری کی مہم ہے کہ ہم خدا کی راہ پر چلیں"
(سکندریہ کے کلیمنٹ کا قول ۱۹۰ء)

چوتھا باب

قانسطنطائن کی تبدیلی زندگی

رُومی سلطنت میں کلیسیا کی ایذارسانی کی ابتدا اس وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ شہنشاہ نیرو کسی نہ کسی جماعت کو ظلم وستم کا نشانہ بنانا چاہتا تھا اور مسیحی جماعت اُس کے دامِ فریب کے لئے ایک مناسب و موزوں شکار تھی۔ بعد ازاں دومیتین (DOMITIAN) بغاوت کا شاکی تھا اور اُسے یہ محسوس ہُوا کہ شاید مسیحی لوگ اُس کے خلاف بغاوت کریں۔ دُوسری صدی میں مسیحیوں کے خلاف جبر و ستم کی تلوار اس لئے چلائی گئی کیونکہ وہ شہنشاہ رُوم کی پرستش کرنے سے انکار کرتے تھے۔ تیسری ایذارسانی کی وجہ خاص حکومت کی اپنی پالیسی تھی کیونکہ اس وقت کلیسیا بہت زیادہ مضبوط ہو رہی تھی لہٰذا اس کا چلا جانا قرینِ مصلحت قرار دیا گیا۔

چوتھی صدی میں سلطنتِ رُوم کا زوال:۔

چوتھی صدی میں شہنشاہ ڈایوکلیشن (DIOCLETIAN) نے مُصمم ارادہ کیا کہ وہ کلیسیا کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ اُسے سلطنتِ روم ایک بہت بڑے اور بڑھتے ہُوئے خطرے میں پھنسی ہُوئی نظر آئی۔ شہنشاہ نے محسُوس کیا کہ اگر سلطنت کے

اجزا میں ربط واتحاد نہ پیدا کیا گیا تو اس کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ سلطنت کی سالمیت کے لئے جو خطرہ نظر آرہا تھا وہ ان وحشی اقوام کی آمد تھی جو یورپ کے شمال میں رائن اور ڈینوب (THE RHINE AND DENUBE) سے پرے بستے تھے۔ وہ جنگل اور مضطرب لوگ تھے اور متواتر ایک خطہ سے دوسرے خطہ میں مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کا دباؤ مغرب اور جنوب کی اطراف میں تھا۔ سلطنت کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ رومی افواج تھیں جو انہیں پیچھے دھکیلنے میں کوشاں رہتی تھیں۔ لیکن یہ جنگلی اقوام اپنے اجاڑ اور بنجر علاقوں سے نکل کر سلطنتِ روم کے گرم اور زرخیز ممالک میں داخل ہو گئی تھیں۔

سلطنتِ روم کی افواج کی حالت، جو طویل سرحدوں کی حفاظت کیا کرتی تھیں، اب پہلے کی طرح نہ رہی تھی۔ روما کی ابتدائی فتوحات ان سپاہیوں کی ہمت و استقلال کا پھل تھا جن کی تربیت سختی اور سادگی سے رومی جمہوریت کی زندگی میں ہوئی تھی۔ اب فوج ان آدمیوں پر مشتمل تھی جو سلطنت کے تمام حصص کے باشندے تھے۔ ان میں سے چند سپاہی سلطنت کے بیرونی علاقوں کے وحشی بھی تھے۔ ان لوگوں کی وفاداری زیادہ تر رومی فوج سے وابستہ تھی، اُن کی وفاداری روم کے شہر سے نہ تھی۔ موجودہ دور میں اب رومی فوج ہی سلطنت کی سب سے بڑی قوت تھی اور عام طور پر وہ اپنے فوجی حکام کو اپنے ذاتی انتخاب کے مطابق اقتدارِ شاہی پر متعین کرتی تھی۔

اب ملک کے داخلی امور میں بھی وہ قدیم باتیں نہ رہی تھیں۔ روم سے سادگی کی زندگی کافور ہو چکی تھی۔ رومی عوام سُست الوجود بن چکے تھے۔ اب وہ اپنے ہاتھوں سے گھریلو کام اور کھیتی باڑی کے کام کاج نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے یہ کام غلاموں کے سپرد کر دیا تھا۔ ملک میں کثیر التعداد غلام پائے جاتے تھے۔ یہ

غلام عام طور پر اسیرانِ جنگ ہوا کرتے تھے جو اپنے آقاؤں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی خوشی اس بات میں تھی کہ وہ ان کی تباہی اپنی نظروں سے دیکھیں۔ رومی لوگ خود تو شہروں میں رہتے تھے اور اس بات کے متمنی تھے کہ انہیں خوراک اور دل بہلاؤ کا سامان مفت پہنچایا جائے۔ وہ اپنے لمحاتِ زندگی عیش و عشرت کے حماموں اور تماشہ گاہوں میں صرف کیا کرتے تھے۔ ان تماشہ گاہوں میں وہ سب طرح کے تماشوں سے دل بہلاتے تھے مثلاً وہ پیشہ ور تیغ زن۱؎ لوگوں کے مقابلے، جنگلی جانوروں کی نمائش جو دور دراز ممالک سے لائے جاتے تھے۔ انہیں یا تو آپس میں لڑایا جاتا تھا۔ یا انہیں غلاموں اور مجرموں کو مارنے اور کھانے کے لئے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ ان مجرموں میں مسیحی لوگ بھی ہوتے تھے جنہیں سزائے موت دی جاتی تھی۔ یہ تماشے برائے نام دیوتاؤں کی تعظیم و تکریم کے لئے کئے جاتے تھے اور قدیم رومی مذہب کا حصہ تھے۔ یہ قدیم رومی مذہب اب صفحہ ہستی سے مٹ رہا تھا۔ کوئی شخص بھی درحقیقت سورج، آسمان، ہوا یا اناج کے دیوتاؤں پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اب ان دیوتاؤں کے شاعرانہ نام ہی رہ گئے تھے اور ان کی پرستش محض ایک رسمی چیز تھی۔ بہت سے لوگ قدیم مذہب کی بجائے مسٹری ریلیجن۲؎ کی طرف رخ کر رہے تھے اور انہیں ان مذاہب میں اطمینان اور روحانی قوت نظر آ رہی تھی۔ ان مذاہب کی بنیاد ایک حقیقت یعنی محض تمنا یا آرزو پر مبنی تھی تاکہ انسان کے لئے ممکن تھا کہ وہ ان مذاہب کے چشموں سے اپنی شخصی زندگی کو فیض یاب کرتا لیکن یہ مذاہب ایک حکومت کی عوامی زندگی یا اہلِ دنیا کو مدد نہیں دے سکتے تھے مسیحی مذہب کا تعلق

۱؎ انہیں گلیڈی ایٹر کہتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر اپنے مدِمقابل کھلاڑی کا موت تک مقابلہ کرتے تھے۔

۲؎ MYS. TERY R ELEGION.

عوام الناس کی زندگی سے تھا لیکن مسیحیت حکومت سے کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کر سکتی تھی۔ شاہی حکام اپنے اپنے عہدوں کی بنا پر کافروں کی رسوم میں شرکت کرنے پر مجبور تھے اور اسی چیز نے عام طور پر مسیحیوں کے لئے یہ بات ناممکن کر دی تھی کہ وہ حکومتِ وقت کے عہدوں کو قبول کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے حکومت کو امداد دینے سے منہ موڑ لیا جبکہ اُن کی امداد حکومت کے لئے بے حد سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔

ان سب باتوں پر غور و خوض کرتے کرتے شہنشاہ ڈایوکلیشن کی تشویش معقول نظر آتی ہے۔

ڈایوکلیشن[1] ایذارسانی سنہ ۳۰۳ء

شہنشاہ نے سنہ ۳۰۳ء میں مصمم ارادہ کیا کہ وہ اس کام کا بیڑا اُٹھائیگا جس کو دیگر رومی شہنشاہ نہ کر سکے نیز وہ جبراً مسیحیوں کو رومی اطاعت پر مجبور کرنے لگا۔ اُس نے فرمان جاری کیا کہ سلطنت روم کے ہر حصہ میں بیک وقت ایذارسانی شروع کر دی جائے۔ اس ایذارسانی کا رُخ تقرر شدہ خدام الدین اور خاص طور پر بشپوں کے خلاف تھا۔ گرجوں کو سپردِ آگ کیا گیا اور کتاب مقدس کے نسخوں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ اذیت کا زور گیارہ سال تک جاری رہا لیکن یہ اپنا مقصد پورا نہ کر سکی۔ کلیسیا کا وجود مٹایا نہ جا سکا کیونکہ کلیسیا بہت مضبوط تھی۔ مجسٹریٹ اس قابل نہ رہے تھے کہ اس کام کو اختتام تک پہنچا سکتے اور عوام کے جذبات بھی بدل چکے تھے۔ صرف ایک شخص کو اس بات کی تفہیم ہوئی کہ ایذارسانی کو بند کرنا لازمی امر ہے۔ وہ بھانپ گیا کہ یہ قدم

---

[1] DIOCLETIAN'S PERSECUTION.

اُٹھانا کیوں ضروری ہے۔ اس شخص کا نام قانسطنطائن تھا جو بالآخر ڈایوکلیشن کا جانشین بنا۔ اس نے محسوس کیا کہ چونکہ کلیسیا بہت مضبوط ہے یہی بہتر ہوگا کہ حکومت اُسے اپنا دوست بنالے۔ حکومت کو نئی زندگی یا اس خونِ گرم کی ضرورت ہے جو کلیسیا کی رگوں میں متحرک ہے اور جس سے کلیسیا کا جامِ حیات لبریز ہے۔ درحقیقت قانسطنطائن کو اسی چیز کی ضرورت تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اُسے بھی خود مسیحی ہونا چاہیئے۔

قانسطنطائن کی مذہبی تبدیلی ۳۱۲ء

جب ڈایوکلیشن معمر ہوگیا تو اُس نے اپنا تخت چھوڑ دیا۔ اس پر بہت سے سرداروں میں ایک جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ وجدل سے قانسطنطائن اُبھرا اور اُس نے ایک خود مختار شہنشاہ کی حیثیت اختیار کی فتحمند ہوا اور ایک مسیحی کی حیثیت سے بالآخر تماشہ گاہِ عالم پر آیا۔ بڑا مورخ یوسیبس (EUSEBIUS) جس کا نام ہم نے دوسرے باب میں سنا تھا ہمیں بتاتا ہے کہ آخری شب میں یعنی فیصلہ کن جنگ سے قبل (۳۱۲ء میں) شہنشاہ قانسطنطائن نے خواب میں آسمان پر صلیب کو دیکھا اور اُسے ایک آواز کہہ رہی تھی کہ

"اس نشان کا مفہوم تمہاری فتح و نصرت ہوگی"

چنانچہ اُس نے اپنے دشمنوں کو فتح کیا اور ۳۱۳ء میں اُس نے میلان[1] کا فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کے مطابق اس کی رعایا کے سب لوگوں کو اجازت دی گئی کہ وہ جس مذہب کو چاہیں اُسے قبول کر سکتے ہیں۔

قانسطنطائن رُوما کا پہلا مسیحی بادشاہ تھا۔ اُس نے ایک نیا شہر تعمیر کیا اور اس شہر کو رُوما کی بجائے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس شہر کا نام قسطنطنیہ تھا۔

---

[1] EDICT OF MILAN.

جسے مروجہ زبان میں استنبول کہتے ہیں یہ بوسفرس (BOSPHARUS) کے کنارے پر آباد ہے۔ یہاں سمندر یورپ اور ایشیا کے بیچ میں تنگ ہو گیا ہے۔ اس شہر کو ایک مسیحی شہر کہلانا تھا جس میں بہت سے گرجے نظر آئیں اور اس میں کوئی بتکدہ نہ ہو۔ اس شہر کو بت پرستی سے بالکل پاک وصاف اور قدیم دارالسلطنت کی آلودگی اور بداخلاق سے مبرّہ و منزّہ نظر آتا تھا۔ رُومی افواج کے پرچموں پر مسیحی نشان یُونانی الفاظ میں XP منقش تھا۔ اس کو ہم انگریزی میں CHR لکھتے ہیں اور یہ نشان ربنا المسیح کے اسم مبارک کا نشان ہے۔ اپنی زندگی کی تبدیلی کے چند سالوں کے بعد قسطنطین نے ایک قانون وضع کیا جس کے مطابق اتوار عوام کے لئے تعطیل کا روز بن گیا۔ لہٰذا اتوار کے روز عوام بلا رکاوٹ کلیسیائی عبادتوں میں شریک ہو سکتے تھے۔ مسیحیوں نے اس دن کو متواتر عبادت کا دن منایا۔ اب یہ دن عوام کے لئے آرام کا دن بن گیا ہے۔

چنانچہ اس طرح کلیسیا اور سلطنت کی کشمکش اُن کی صلح اور ملاپ میں ختم ہو گئی۔ اس حیران کن نتیجہ نے مسیحیوں کے قلوب میں ایک زبردست اطمینان پیدا کر دیا۔ اب وہ ایذا رسانی کے متواتر خوف سے آزاد ہو گئے تھے اور وہ مجموعی طور پر آزادی کے ساتھ ایسے عملی اقدام اُٹھا سکتے تھے جو اس سے قبل ناممکنات میں سے تھے۔ اس آزادی کا انجام بہت جلد عظیم کونسلوں (THE GREAT COUNCILS) میں تشکیل ہو کر منظرِ عام پر آ گیا۔ اس کا تذکرہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔

سلطنت کی مذہبی تبدیلی:-

مذکورہ بالا معاملات تو قابلِ اطمینان تھے لیکن دیگر امُور اتنے دلپذیر نہیں

تھے۔ سلطنت روم کی تبدیلی، جیسے کہ کہا گیا ہے، محض سطحی چیز تھی۔ قانسطنطائن نے مسیحی مسلمات کو محض ایک وسیلہ تصور کیا تھا جس سے وہ عوام الناس کی بہتری و بہبودی کا طالب تھا۔ اگرچہ وہ ایک ایماندار شخص تھا تاہم اُس نے اپنے بپتسمہ کو زندگی کے آخری ایام تک ملتوی کر دیا تھا۔ اس طرح وہ درحقیقت اپنی حکومت کے طویل عرصہ میں ایک شریک کلیسیا نہ بنا۔

جب اُس نے اپنے پرچموں پر ربنا المسیح کا اسم مبارک لکھوایا تو وہ اس بات کو فراموش کر گیا کہ ربنا المسیح کی بادشاہت اس دنیا کی نہیں (ملاحظہ ہو یوحنا ۱۸ : ۳۶) قانسطنطائن کی مذہبی تبدیلی نے مسیحیت کو معاشرے کا فیشن بنا دیا۔ بہت سے لوگ آگے بڑھ بڑھ کر کلیسیا کے شرکا بن گئے یعنی وہی لوگ جو چند سال قبل کلیسیا کو اذیت دینے پر کمربستہ تھے۔ ممکن تھا کہ یہی لوگ اب بھی قانسطنطائن کے اشارے سے کلیسیا کو دوبارہ اذیت دینے پر آمادہ ہو جاتے۔

اگر قانسطنطائن بذات خود ایک کامل مسیحی بن کر اطمینان پاتا اور اپنی رعایا پر بحیثیت ایک مسیحی کے حکومت کرتا اور اُسے ایک مسیحی حکومت میں تشکیل کرنے کی سعی نہ کرتا تو اس معاملہ میں کلیسیا کی فتح زیادہ بھڑکیلی نہ ہوتی بلکہ زیادہ ٹھوس ہوتی۔ جب قانسطنطائن نے ربنا المسیح کا روح افزا اسم مبارک اپنے پرچموں پر لکھوایا تو اگرچہ اُس نے اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا تاہم اُس نے درحقیقت اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی سلطنت کو ان لوگوں کا خادم بننا ہے جن پر وہ حکومت کرنے کی متمنی ہے نیز اُسے اس سلسلہ میں اپنی زندگی بہتوں کے لئے فدیہ میں دینا چاہیئے (ملاحظہ ہو مرقس ۱۰ : ۴۵) جدید اقوام بھی بعینہٖ یہی اقدام لیتی ہیں جب وہ صلیب کے نشان کو اپنے پرچموں پر بناتی ہیں۔ اُس کی اس غلطی کا الزام شہنشاہ سے زیادہ اُس وقت

کی کلیسیا کے قائدین پر لگنا چاہیئے، جنہوں نے اُسے مذکورہ تعلیم دینے سے کوتاہی برتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مغربی تہذیب کی تعمیر ایک دیوار کی طرح ہوئی جس میں ایک شگاف ہو۔ یہ شگاف ایک سے زائد دفعہ خطرناک ثابت ہُوا اور موجودہ وقت میں یہ شگاف ساری دیوار کو گرانے کا اندیشہ پیدا کر رہا ہے۔ چوتھی صدی ہی میں بہت سے لوگ مطمئن نہ تھے۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ کلیسیا نے اپنے نمایاں حسن و جمال کو کھو دیا ہے، کیونکہ اب وُہ شہادت کے نورانی تاج کو کھو چکی تھی۔

ایرانی ایذا رسانی، چوتھی اور پانچویں صدیاں۔

شہادت کا وُہ نورانی تاج اب مشرقی کلیسیا کے خون آلودہ سر پر رکھا گیا تھا۔ حکومتِ ایران متواتر سلطنتِ رُوم کی مخالف رہی تھی۔ جب تک مسیحی لوگ مغرب کی سرزمین میں اذیت کا شکار بنتے رہے وُہ مشرق میں کسی قدر محفوظ تھے۔ لیکن جونہی وُہ قسطنطنیہ میں منظورِ نظر ہوئے اُن کی حیثیت ایران میں دشمن کی حیثیت بن گئی۔ ایران میں پہلی اذیت کی آگ ۳۳۹ء میں بھڑک اُٹھی اور چالیس سال تک جلتی رہی۔ اس کے بعد اگلی صدی میں اذیت کے ان شعلوں نے دوبارہ مسیحیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مابعد کی اذیتوں سے مسیحی لوگ رُومی اذیتوں کے مقابلہ میں زیادہ تعداد میں مارے گئے۔ روایت ہے کہ ایک موقع پر کرکوک (KIRKUK) کے شہر میں سولہ ہزار ایمانداروں نے بیک وقت جامِ شہادت پیا۔ ایرانی لوگ ظلم و تشدد میں ضرب المثل تھے۔ وُہ ظلم و تشدد کے ہیبت ناک طریقوں کو معلوم کرنے میں چابکدستی سے کام لیتے تھے۔ لیکن اس جور و ستم کے باوجود بہت سے مسیحیوں نے اپنی تکلیفات اور موت کا مقابلہ غازیانہ

ہمت و استقلال سے کیا۔

مارتوما ۳۴۵ء

یہ کہا جاتا ہے کہ ایک ایرانی سوداگر بنام مارتوما اذیت رسانی سے بچکر مالابار ساحل پر وارد ہو گیا (تقریباً ۳۴۵ء) یہاں جاتے پناہ پا کردہ ایران واپس گیا اور آٹھ سو خاندانوں کو جمع کیا جو اُس کے ساتھ چلے آئے اور ہندوستان میں مقیم ہو گئے۔ اُن کے قیام سے مالابار کی کلیسیا بہت مضبوط ہو گئی۔ یہ لوگ سیرین مسیحیوں کے آباؤ اجداد ہیں۔ اگرچہ یہ بات روایت پر مبنی ہے اور اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں تاہم اس کا اثر آج کے دن تک مالابار کی کلیسیا پر بہت پڑا ہے۔

"خونِ شُہدا تخمِ کلیسیا ہے۔" (قولِ طرطلین)

پانچواں باب

کونسلیں، آگسٹین[1] اور جیروم

ایک مسیحی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے قانسطنطائن کا پہلا قدم یہ تھا کہ اُس نے کل کلیسیا کو بمقام ناسیہ جمع ہونے کی دعوت دی۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر

---

[1] AUGUSTINE AND JEROME.

تھا جو قسطنطنیہ سے بہت دُور تھا لیکن یہ مقام اس خطّہ کے ایشیائی حصّہ میں تھا۔ یہ بات ایک عجوبہ سی معلوم ہوتی ہے کہ شہنشاہ کا تا ہنوز بپتسمہ نہ ہُوا تھا لیکن اُس کو اختیار حاصل تھا کہ ایک کونسل کا انعقاد کرے اور اس کونسل میں نہ صرف اُن بشپ صاحبان کو مدعو کرے جو رُومی سلطنت میں مقیم تھے، بلکہ اُن بشپوں کو بھی بُلائے جو سلطنت کی حدُود سے باہر بستے تھے۔ تاہم وُہ سب کے سب آنے کے لئے تیار تھے اور یہ بات بے حد ضروری تھی کہ وُہ مذکورہ کونسل میں شمولیت کے لئے آتے۔

بلحاظ اہمیت جو سوال کونسل کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا مسیحی عقیدہ کے متعلق تھا۔ اس سے قبل اس مسئلے پر بہت سے سوالات پیدا ہو چکے تھے جو غور طلب تھے۔ جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا ہے تو عوام فوراً ہی اس کو کما حقّہٗ طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے واقعہ کو سمجھنے کے لئے عام طور پر ایک طویل عرصہ کی ضرورت ہوتی ہے اس سے قبل کہ اس حقیقت کو لفظی جامہ پہنایا جاتا، ابن اللہ کا مسئلہ تجسم نسل انسانی کی تاریخ میں سب سے اہم مسئلہ تھا۔ عوام اس مسئلے کے متعلق تب ہی اپنے خیالات کو بیان کر سکتے تھے اگر وُہ ذاتی تجربے سے اس بھید سے مانوس ہوتے۔

بدعات :-

عہدِ جدید کے اوراق میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ جب اوّلین نو مُریدوں کو بپتسمہ (اصطباغ) دیا گیا تو وُہ خداوند المسیح کو اپنا مالک (LORD) سمجھ کر ایمان لاتے تھے یا دیگر الفاظ میں اُنہیں " یسوع مسیح کے نام پر " (ملاحظہ ہو اعمال ۲ : ۳۸ ، ۱۰ : ۴۸) بپتسمہ دیا گیا تھا۔ اُنہوں نے نہ تجسم کا لفظ استعمال

کیا تھا اور نہ اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ وُہ تثلیث جلیل پر ایمان لائے تھے درا صل یہ الفاظ ان حقائق کو جن پر کلیسیا ابتدا ہی سے ایمان رکھتی تھی ادا کرنے کی غرض سے استعمال کئے گئے تھے ۔ اگرچہ کلیسیا مجموعی طور سے متواتر یہی ایمان رکھتی تھی، تاہم کلیسیا میں متعدد لوگ تھے جنہوں نے ایمان کے ایک جُز یا دُوسرے جز کو تھام رکھا تھا اور وُہ اُس خیال میں مگن تھے کہ وُہ سالم ایمان پر ایمان رکھتے ہیں ۔ اس قسم کے اعتقاد کو بدعت کہا گیا ہے جس کا مطلب ہے چُننا یا انتخاب کرنا ۔

بعض لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ خُداوند المسیح محض ایک انسان تھے اور اُن میں الُوہیت نہیں تھی ۔ یہ دعویٰ عام طور پر شُروع ہی سے کیا گیا تھا لیکن درحقیقت وُہ نہیں جب اُس کے گہرے دوستوں نے بیان کی تھی ۔ یہ نظریہ اُن واقعات کی ترجمانی کرنے سے معذور ہے جو فی الواقعہ ظہُور پذیر ہُوئے تھے ۔

ڈوسیٹیس (DOCETISIS) اور اُن کے بعد غناسطی (GNOSTICS) لوگ کہتے تھے کہ وُہ ایک حقیقی انسان تھا ۔ اُس کی انسانی فطرت محض ایک فریب نظر تھی ۔ ہم جانتے ہیں کہ اس طبقہ کے لوگوں کو پہلا جواب یُوحنّا کی انجیل میں دیا گیا ہے ۔

غناسطیوں (GNOSTICS) کی کئی قسمیں ہیں ۔ ان سب کا خیال تھا کہ مادہ شر انگیز ہے اور یہ خیال ناممکنات میں سے ہے کہ خُدا مادے سے مس ہُوا تھا ۔ لہٰذا ان کا ایمان تھا کہ وُہ ذات جس نے کائنات عالم کو تخلیق کیا ہے خُدا نہیں تھی ۔ بلکہ وُہ خُدا سے ادنیٰ طبقہ کی قوت تھی ۔ (غناسطی لوگ اُسے (DEMIURGE) یا خالق کے نام سے موسُوم کرتے تھے ۔ یہی چیز اہلِ یہُود کا خُدا تھا جس کا بیان عہدِ عتیق میں مندرج ہے ۔ ان لوگوں کی تعلیم یہ تھی کہ فرشتگان کا ایک سلسلہ ہے یا یُوں کہیں کہ خُدا اور دُنیائے عالم کے مابین مظہر ہیں ۔

اور ان طبقات میں سب سے نچلا یا ادنیٰ طبقہ یا وجود ربنا المسیح کا ہے۔ جو حضرت انسان کو (DEMIURGE) کے تسلط سے رہائی دینے اور اس کے لئے خدا تعالےٰ تک پہنچنے کی راہ بنانے کی غرض سے آیا تھا۔ لیکن یہ نجات محض رُوحانی لوگ ہی حاصل کر سکتے تھے۔ کثیر التعداد لوگوں کے لئے نجات پانا امر محال تھا۔

ہم سب سے پہلے غناسطیوں (GNOSTICS) کا سراغ مقدس پولس رسول کے خطوط میں جو کلیسوں اور عبرانیوں کے نام پر لکھے گئے ہیں پاتے ہیں۔ غناسطیت (GNOSTICISM) کبھی بھی پورے طور سے نہیں مٹی بلکہ زمانۂ حال میں اس کے اثرات تھیوسوفی (THEOSOPHY) اور دیگر ذہنی تعقورات میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سب بدعات کسی نہ کسی طریق سے یہ بیان کرتی ہیں کہ ربنا المسیح کون تھا اور وہ کس طرح انسان اور خدا تھا۔ مونٹانسٹس (MONTANISTS) اس خیال کے برعکس کلیسیائی نظم ونسق کی تشویش میں اُلجھے پڑے تھے۔ شروع شروع میں ان لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا جو فریگیہ (PHRYGIA) کے پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا تھا۔ اس گروہ کی ابتدا دوسری صدی کے وسط سے ہوئی۔ یہ لوگ بشپوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ناپسند کرتے تھے اور نبوت کے انعام اِلٰہی کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا یہ اعتراض تھا کہ کلیسیا بے عام بہت جلد گناہوں کو معاف کر دیتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اصطباغ کی رسم کے بعد کبھی بھی سنگین یا مہلک (MORTAL) گناہ معاف نہیں کئے جانے چاہیئیں۔ ان کے خیال کے مطابق نکاح ایک نا عاقبت اندیش رغبت ہے اور نکاح ثانی ایک گناہ ہے۔ اس فرقے میں نبوت کرنے والی عورتیں تھیں جن کی اہمیت کی وجہ سے یہ فرقہ قابلِ ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے پرپیتوا (PERPITUA)

شہید مذکورہ بالا عورتوں میں سے تھی۔ طرطلین جس نے پرپیتوآ کے خطوط کو جو کلیسیا کے نام پر لکھے گئے تھے مکمل کیا تھا، اس فرقے کا سب سے سربرآوردہ رکن تھا۔

پس ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ناسیہ کی کونسل (COUNCIL OF NIACA) سے قبل ابتدائی کلیسیا میں بہت سی مذہبی جماعتیں تھیں جو کسی نہ کسی خاص اصول کی پابند تھیں۔ بہت سے مسیحی اُستادوں نے اپنے خیالات کی منادی کی اور کتابیں لکھیں اور ان کی وساطت سے مسیحی عقیدے کا راز سربستہ بتدریج کھلتا گیا لیکن بہت سے لوگوں نے اس کام کو جاری رکھا جیسا کہ شروع سے کرتے چلے آتے تھے۔ وُہ ان حقائق کو جو انہوں نے کلیسیا، کتاب مقدس اور اپنے ذاتی تجربات سے حاصل کئے تھے اعملی زندگی میں ظاہر کرتے رہے چشم دید گواہ ان حقائق کو جو اُن کی نظروں کے سامنے آئے تھے تاریخی شہادتیں چھوڑ گئے تھے نیز ہر ایک پُشت بار بار اس حقیقت سے مانوس ہوئی کہ ربنا المسیح درحقیقت انہیں گناہ سے شفاعت دینے والا ہے اور اُس نے خدا کو ہم پر ظاہر کیا ہے۔ وُہ اس عقیدے کو قطعی طور سے واضح کئے بغیر اس پر عامل تھے۔

ناسیہ کی کونسل:-

چوتھی صدی میں سکندریہ میں ایک مُبَشِّر تھا جس کا نام ایریس (ARIUS) تھا۔ وُہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ خدا نے مسیح کو ابتدائے آفرینش سے قبل تخلیق کیا تھا تاکہ وُہ موجودات کو تخلیق کرے۔ لہٰذا اگرچہ مسیح ایک مخلوق ہستی ہے اور خدا نہیں، اُس کے لئے واجب ہے کہ خدا کے نام سے موسوم ہو اور خدا کی مانند کہلایا جائے۔ ایریس ایک شکیل وجمیل اور فصیح اللسان شخص تھا اور وُہ نہایت

SCHOOLS OF THOUGHT. ۱ے

THE COUNCIL OF NIACA, 325.A.D ۲ے

باضابطہ اور نیک سیرت زندگی بسر کرتا تھا۔ عوام اُس کے شیدائی تھے اور بہت سے لوگ اُس کی تعلیم کی پیروی کرتے تھے۔ لیکن بعض لوگوں نے اُس کو رد کر دیا تھا۔ ۳۲۵ء میں قانسطنطائن نے ناسیہ کی کونسل کا اہتمام کیا تاکہ اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ راست عقیدہ کونسا ہے۔ کلیسیا کے تمام حصص سے ۳۱۸ بشپوں نے اس میں شرکت کی سلطنت کے مغربی حصہ کے مقابلہ میں بشپوں کی زیادہ تعداد مشرقی حصہ اور مشرقی ممالک سے تھی۔ تاہم ایک مغربی بشپ نے جو کارڈوا ملک سپین کا باشندہ تھا، اس کانفرنس کی صدارت کی کیونکہ وہ مذکورہ بالا کانفرنس میں متقدم بشپ کی حیثیت رکھتا تھا۔ سب بشپ صاحبان ناسیہ کے عظیم گرجا میں جمع ہوئے اور قانسطنطائن نے آکر اس مجلس کا افتتاح کیا۔ قانسطنطائن نے بشپوں کو ایک مفید سبق دیا۔ وہ اپنے لبادے کے اندر خطوط کا ایک پلندہ دبائے ہوئے لایا جو اُن بشپوں نے خود اُسے لکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ان خطوط میں شکایات درج تھیں جو ہر ایک بشپ کسی دوسرے بشپ کے خلاف شہنشاہ کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اُس نے ان خطوط کو باہر نکالا اور کونسل کو بتایا کہ اُس نے ان خطوط کو ہنوز نہیں کھولا اور نہ ہی اُنہیں کھولے گا۔ پھر اُس نے ان تمام خطوط کو آگ میں پھینک دیا۔ بشپوں کو کھٹک گئی کہ اُس کی طرز معقول و جائز ہے اور وہ نادم ہوئے۔

ناسیہ کا عقیدہ۔

یہ کونسل تین روز تک جاری رہی۔ ایریس (ARIUS) نے اپنے نظریے کی توضیح و تشریح کی اور کثیر التعداد بشپوں نے اپنے کانوں کو بند کر لیا اور سب نے

بآواز بلند پکار پکار کر کہا کہ ایسی تعلیم کلیسیا کی مسلّم تعلیم نہیں تھی۔ لیکن جب اُنہوں نے اپنے مسلّمات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی سعی کی تو انہیں یہ کام مشکل نظر آیا۔ وہ اس بات پر رضامند تھے کہ ایسے الفاظ کو استعمال کریں جو عہد جدید کے اوراق میں موجود نہیں۔ وہ کسی بھی اصطلاح پر متفق الرائے نہ ہو سکے۔ ایریئس کے لئے یہ ممکن الامر تھا کہ وہ ان بشپوں کو اس خیال کی طرف آمادہ کرتا کہ اس کی یہ اصطلاح کہ مسیح باپ کے ساتھ "مشابہ فطرت" رکھتا تھا؛ ان کے خیال کی کسی قدر ترجمانی کرتی ہے۔ لیکن اس مجلس میں ایک سُلجھا ہوا شخص بنام اتھاناسیس (ATHANASIUS) موجود تھا جو کہ ایک ڈیکن تھا۔ وہ سکندریہ کے بشپ کے ہمراہ آیا ہوا تھا۔ اُس نے اصرار کیا کہ یہ اصطلاح کلیسیا کے مسلّمات کے متعلق غلط بیانی کرتی ہے اور اُس نے کونسل کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ دورِ جدید میں جدید اصطلاحات کو استعمال کرنے سے خائف نہ ہوں اور محض عہد جدید کے الفاظ ہی سے نہ چمٹے رہیں بلکہ وہ اپنے زمانے کی زبان کو سچائی کے اظہار کے لئے استعمال میں لائیں۔ چنانچہ آخرکار کونسل نے گہری غور و خوض اور شدت کی دعاؤں کے بعد مسیحی ایمان کا ایک بیان مرتب کیا یعنی ایک کریڈ (CREED) تیار کی۔ اُنہوں نے کہا کہ، "اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے"۔ جہاں تک کریڈ کا تعلق ہے یہ کریڈ بعینہٖ وُہی ہے جو ہم اب استعمال کرتے ہیں۔ البتہ اس کے الفاظ کی ترتیب یا بندش میں کچھ اختلافات ہیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ ہمارا خداوند کنواری مریم سے مجسم ہُوا" اس کریڈ میں مرقوم تھا کہ وہ "نیچے اُترا اور مجسم ہُوا"۔ مذکورہ کریڈ اس اعلان سے ختم ہوتی تھی۔ کہ "ہم ایمان رکھتے ہیں . . . روح القدس پر"۔ لیکن بعد کی کونسلوں میں کریڈ میں سے چند اصطلاحات تبدیل کر دی گئیں تھیں۔ مگر کریڈ کو تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا ابھی تک ہم اسے نائسیہ[ف] کی کریڈ کے نام سے

ف: THE NICENE CREED.

پکارتے ہیں۔

کلیسیا میں ایک اور کریڈ بھی مستعمل ہے جسے رسُولوں کا عقیدہ کہتے ہیں۔ تھوڑی سی لفظی تفاوت کے ساتھ یہ کریڈ ہر ایک کلیسیا میں نوکِ زبان تھی بپتسمہ پانے والے اُمیدوار اسے دہراتے تھے جیسے کہ آجکل بھی رواج ہے۔ اتھاناسیس کا عقیدہ[1] بہت بعد میں ضبطِ تحریر میں آیا تھا۔ یہ عقیدہ اتھاناسیس کے نام سے کہلایا کیونکہ اُس نے ایک جیّد عالم ہونے کی حیثیت سے اس بحث میں حصہ لیا تھا۔ ان دونوں میں سے ایک بھی جنرل کونسل میں پاس نہ ہُوا۔

دیگر کونسلیں :-

مذکورہ بالا جھگڑا ناسیہ کی کونسل میں طے نہ ہو سکا۔ ایرین لوگوں نے اپنی ہار نہ مانی ۳۵۹ء میں اُنھوں نے تصفیہ کیا کہ اطالیہ میں ایک اَور کونسل بمقام رمنی (RIMINI) منعقد کریں۔ اس کانفرنس میں اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ "ایک ہی جوہر[2]" کے الفاظ پر زور دیں۔ لیکن ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ کی کونسل نے اس فیصلے کو اُلٹا دیا اور اس امر کا اعلان کیا کہ ناسیہ کا عقیدہ کلیسیا کا درست عقیدہ متصوّر کیا جائے گا۔ کونسل نے ترتیبِ الفاظ اور عرضی دعوٰی میں چند تبدیلیاں کیں اور "میں ایمان رکھتا ہوں رُوح القدس پر . . ." کے الفاظ کے ساتھ "باپ . . . سے صادر ہے" کے الفاظ بڑھا دئے۔

اس سے اگلی صدی میں یعنی پانچویں صدی میں افسس میں دو کونسلیں منعقد ہُوئیں جن کے لئے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے۔ ناسیہ کی کونسل، قسطنطنیہ کی کونسل اور افسس کی پہلی کونسل پہلی تین کونسلیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ چوتھی کونسل

---

[1] ATHANASIAN CREED OR "QUICUNQUE"
[2] OF LIKE SUBSTANCE

۴۵۱ء میں بمقام چالسیڈون (CHALCEDON) منعقد ہوئی تاکہ اُن تمام حل طلب مسائل کو جو مذکورہ بالا کونسلوں سے رہ گئے تھے حل کرے۔ بعد ازاں ۵۵۳ء اور ۶۸۰ء میں دو اور جنرل کونسلیں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئیں۔ ان میں کوئی قابلِ ذکر معاملہ طے نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد کونسلوں کا دَور ختم ہوگیا۔ زمانے نے ایسا رنگ بدلا کہ سب کچھ درہم برہم ہوگیا اور ان حالات میں کانفرسوں کا انعقاد ایک ناممکن امر تھا۔ اس کے بعد ایک کانفرنس بھی منعقد نہیں ہوئی۔ ان کونسلوں نے کلیسیا کے لئے ایک عظیم الشان کام سرانجام دیا اور یوں یہاں الفاظ کی بہترین ترتیبیں حاصل ہوئیں جن میں سچائی کا اظہار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن صد حیف کہ انسانی الفاظ سچائی کی ماہیت کو کما حقہٗ طور پر ادا نہیں کر سکتے۔

ہپّو کا آگستین[1] ۳۵۴۔۴۳۰ء

اِس دَور میں بہت سے علما اور جلیل القدر ہستیاں پائی جاتی تھیں۔ ان میں سے دو جید عالم الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ایک کا اسمِ گرامی آگستین تھا جو ہپّو کا بشپ تھا۔ یہ جگہ کارتھیج کے قُرب وجوار میں واقع ہے۔ اس نے اپنی داستانِ حیات ایک کتاب[2] کی صُورت میں قلمبند کی ہے جس کا نام "اعترافات" ہے۔ اس کتاب کا رُوئے سخن انسانوں کی طرف نہیں بلکہ خُدا کی طرف ہے۔ اس کے گناہوں کا بیان، اس کے افکار، اس کی تبدیلیٔ زندگی کے حالات کو ایسا صاف وصریح الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ ہم اُسے بلا تکلف دُرست سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اس کی ایک اور تصنیف کا نام "سٹی آف گاڈ" (THE CITY OF GOD) ہے۔ اس کتاب کو لکھنے سے مصنّف کا یہ منشا تھا کہ وُہ عوام کے خیالات کو رُوما

---

[1] AUGUSTINE OF HIPPO 354.430.

[2] CONFESSIONS.

کے فانی شہر سے، جو ان ایام میں تباہی کے گڑھے میں گر رہا تھا، منتقل کر کے غیر فانی آسمانی شہر یعنی کلیسیا پر جمائے جو کبھی بھی قطعی طور سے برباد نہیں ہوتا۔ اُس نے ایک کتاب مسئلہ تثلیث پر لکھی ہے جس میں ایک دلکش واقعہ ہے

وُہ کہتا ہے کہ ایک روز وہ سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا اور وُہ تثلیث جلیل کے مضمون پر محوِ خیال تھا۔ اس دوران میں اُس کی نگاہ ایک چھوٹے لڑکے پر پڑی جس نے ریت میں ایک گڑھا کھود رکھا تھا اور اس میں سمندر کا پانی ڈال رہا تھا۔ آگستین نے اُس لڑکے سے پوچھا کہ وہ کیا بنا رہا ہے لڑکے نے جواب دیا کہ وہ سمندر کو گڑھے میں بند کر رہا ہے۔ آگستین نے مسکراتے ہوئے لہجہ میں اُس سے کہا: "تم کبھی بھی اس تنگ سوراخ میں سمندر کو نہیں لا سکتے!"

بچے نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں سمندر کو اس سوراخ میں بھر کر دکھا دُوں گا جب آپ تثلیث کے بھید کو اپنے ذہن میں لے آئیں گے!"

جیروم سنہ ۳۴۵-۴۲۰ء

اس دور کی دُوسری عظیم الشان ہستی جیروم ہے۔ وہ کچھ عرصہ تک روما میں مقیم رہا جہاں اُس نے عوام کی بداخلاقی اور لاپرواہی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس پر چند رفقا نے خاص طور پر روما کی چند شریف گھرانوں کی عالی نہاد بیبیوں نے اُس کا ساتھ دیا۔ بعد ازاں وُہ سرزمینِ فلسطین کی طرف روانہ ہوا اور بیت اللحم میں سکونت اختیار کی۔ یہاں اُس نے ایک درویش کی طرح زندگی بسر کرنا شروع کی۔ اُس نے یُونانی اور عبرانی زبانوں کی دسترس حاصل کی اور ان زبانوں سے کتابِ مقدس کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ ان دنوں لاطینی زبان اطالیہ کے لوگوں

کی عوامی زبان تھی اور سلطنت کے مغربی حصہ کے لوگ اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ جیروم کے رُومی حلقہ رفقا میں سے دو معزز خواتین نے اُس کی پیروی اختیار کی۔ اُنہوں نے اُس کی سکونت گاہ کے قریب ایک خانقاہ تعمیر کی جس میں وہ زائرین کے قیام و طعام و صوم کا اہتمام کرتی تھیں۔ ان دونوں خواتین نے یونانی اور عبرانی زبانوں کا بھی مطالعہ کیا اور اُس کے تصنیف و تالیف کے کام میں امداد دیتی رہیں۔ جیروم کا ترجمہ وُلگیٹ (VULGATE) کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ وُلگر (VULGER) یعنی بازاری یا عوام کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ابھی تک رومن کیتھولک کلیسیا میں مروج ہے۔

"ایماندار لوگ خدا کے کلام سے اطمینان پاتے ہیں جب کلامِ الٰہی ہمیں حکم فرماتا ہے کہ جاؤ اور سب اقوام کو سکھاؤ اور اُنہیں باپ، بیٹے اور رُوح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔ لیکن ہم اپنے بدعتی مخالفین کی غلطیوں کی طرف مائل ہو کر خلافِ قانون افعال کے مرتکب ہوتے ہیں اور ناقابلِ قبول بلند لیول پر چڑھنے کا عزم کرتے ہیں اور اپنی زبانوں سے ناقابلِ بیان الفاظ نکالتے ہیں اور ایسی ایسی باتیں تصور کرتے ہیں جو ہم پر واجب نہیں لیکن جبکہ ہمیں واحد ایمان کے وسیلے باپ کی عبادت، بیٹے کی تعظیم اور پاک رُوح کی بھرپوری لازم ہے، ہم موجودہ حالات سے مجبور ہو کر اپنی کمزور انسانی زبان کی دسترس سے کہیں زیادہ اپنی قوتِ گویائی سے کام لیتے ہیں۔ ہم اپنے دُشمنوں کے بد طریقِ کار کے باعث بد طریقِ کار پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ چیز جو خاموش مذہبی مراقبہ یا دھیان کا موضوع بنی چاہیئے تھی اب الفاظ میں ادا ہونے کے باعث خطرے میں پڑ گئی ہے"[1] (ہیلری آف پائٹی ارز چوتھی صدی)

---

[1] HILARY OF POIETIERS FOURTH CENTURY.

چھٹا باب

اِفسس کی دو کونسلیں

ہم نے اِفسس کی دو کونسلوں کا جدا جدا مطالعہ کرنے کی غرض سے اس موضوع کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ :-

اوّل :- ان کا ناسیبہ کے عقیدہ کے واقعات سے کسی قسم کا کوئی بلاواسطہ تعلق نہیں۔

دوم :- ان سے کلیسیا میں پہلی عظیم فرقہ بندی یا بے قاعدگی شروع ہوئی۔ ہم اس افسوس ناک واقعات کے اثرات اب تک محسوس کر رہے ہیں یہ واقعات مذہبی تعلیم پر اختلاف رائے رکھنے کے باعث پیدا ہوتے تھے۔ زمانہ حال میں جب ہم ان واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کلیسیا کی اس بے قاعدگی کا موجب زیادہ تر اختلاف رائے ہی نہ تھا بلکہ لڑنے جھگڑنے والوں کی کڑواہٹ اور بے انصافی تھی۔ اگر ہر ایک شخص جس کا اس معاملہ سے تعلق تھا مقدس پولس کی تعلیم پر عمل کرتا کہ ہم "محبت کے ساتھ سچائی پر قائم رہ کر اور اُس کے ساتھ جو سر ہے یعنی مسیح کے ساتھ پیوستہ ہو کر ہر طرح سے بڑھتے جائیں" (افسیوں باب۴) تو ہمیں بالآخر معلوم ہو جاتا کہ ہم تب ہی سچائی کو بیان کر سکتے ہیں جب ہم واقعی محبت سے کلام کرتے ہیں۔ غصہ اور

کڑواہٹ بہترین استدلال کا ستیاناس کر دیتے ہیں اور ہمیں غلط کاری میں دھکیل دیتے ہیں۔ حالانکہ ہم اپنے دلائل میں حق بجانب ہوتے ہیں جب ہم انہیں مقدس باتوں کی بحث میں داخل کرتے ہیں تو یہ خاص طور پر غلط ثابت ہوتی ہیں اِفسس کی ان دو کونسلوں کے واقعات میں ہمیں یہ زہریلے عناصر صاف صاف نظر آئیں گے۔

انطاکیہ اور اسکندریہ

پانچویں صدی میں دو شہر مسیحی معلومات کے بڑے مراکز تھے یعنی مصر میں اسکندریہ اور سیریا میں انطاکیہ۔ ان دونوں علمی مراکز میں ایک ہی مسیحی عقیدے کی تعلیم دی جاتی تھی تاہم فرق یہ تھا کہ عقیدے کے مختلف نظریات پر زور دیا جاتا تھا۔ ان دونوں شہروں کے علما اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہمارا خُداوند الٰہی اور انسانی دونوں صفات کا مالک تھا۔ اسکندریہ کے علما اُس کی الٰہی فطرت پر زیادہ زور دیتے تھے لیکن انطاکیہ کے علما اُس کی انسانی فطرت پر زور دیتے تھے۔

اِفسس کی پہلی کونسل[1] سنہ ۴۳۱ء

سنہ ۴۳۱ء میں قسطنطنیہ کا نسطوریس (NESTORIUS) جو پیٹری آرچ کے لقب سے ملقب تھا انطاکیہ سے قسطنطنیہ آیا۔ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ در حقیقت ہمارے خُداوند کی ذاتِ مبارک کی دو فطرتیں متحد نہیں تھیں اور خُداوند نے اپنی الٰہی فطرت کو خُدا باپ سے ورثہ میں پایا تھا اور اپنی انسانی فطرت

[1] FIRST COUNCIL OF EPHESUS.

کو اپنی والدہ محترمہ مریم مقدسہ سے حاصل کیا تھا۔ نیز اُس وقت کے دستور کے موافق مریم مقدسہ کو "خدا کی ماں" کہنا ناجائز تھا۔ شہنشاہ تھیوڈوسیس (THEODOSIUS) نے اس مسئلے کے تصفیہ کے لیئے بمقام افسس ایک کونسل کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس کا صدر اور نسطوریس کا مقابلہ کرنے والا شخص مایۂ ناز مقرر سیرل (CYRIL) تھا جو اسکندریہ کا بشپ تھا۔ پہلی بات جس سے کونسل میں غلطی پیدا ہوئی یہ تھی کہ اس موقع پر نسطوریس کے بے شمار دوست غیر حاضر تھے۔ سیرل پندرہ روز تک اِن کا انتظار کرتا رہا لیکن اس سے زائد عرصہ کے لئے اُن کا انتظار کرنا ایک امر محال تھا۔ وہ بشپ صاحبان جو وہاں پہلے سے موجود تھے اس کام کو ختم کرنا چاہتے تھے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آخر کار اُنھوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔

درحقیقت نسطوریس نے ایسی باتیں نہیں کہی تھیں جن کے لئے اُسے ملزم قرار دیا گیا تھا۔ وہ ایسا معقول اور تیز فہم مفکر نہ تھا یا دیگر الفاظ میں یوں کہنا بجا ہوگا کہ وہ سیرل کی طرح ایک اعلیٰ پایہ کا مقرر نہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنی عُذرداری نہ کر سکا۔ اور اُس کے خلاف فتویٰ دیا گیا اور اُسے پیٹری آرچ کے عہدہ سے خارج کر دیا گیا۔ اُسے حکم سنایا گیا کہ وہ انطاکیہ کے قدیم راہب خانہ میں واپس چلا جائے۔ ابھی یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ انطاکیہ کے بشپ بھی وہاں پہنچ گئے اور جب اُنہیں معلوم ہوا کہ سب کارروائی ختم کر دی گئی ہے تو وہ بیحد لال پیلے ہوئے۔ اُنھوں نے اس کونسل کے مدِمقابل ایک دوسری کونسل کا اہتمام کیا اور سیرل کو اُس کے عہدے سے معزول کر دیا۔ اس پر طرفین نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کو اپنی اپنی اپیل بھیجی۔ آخر کار شہنشاہ نے سیرل کا ساتھ دیا۔

ﻪ MOTHER OF GOD

اور اس فیصلہ کو بحال رکھا گیا جس کے مطابق نسطوریس کو ملزم قرار دیا گیا تھا اور اُسے اُسقفی عہدے سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے لیکن اس فعل سے بے حد جذباتی کڑواہٹ پیدا ہو گئی۔ ۴۳۳ء میں سیرل اور انطاکیہ کے بشپ کے مابین از سرِ نو اتحاد کا اہتمام کیا گیا۔ ایسا نظر آنے لگا کہ یہ گتھی سُلجھا دی گئی ہے۔ ۴۳۴ء میں قسطنطنیہ کا بشپی تخت دوبارہ خالی ہو گیا اور نسطوریس کے دوستوں کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ واپس آ جائے۔ لیکن یہ تجویز قبول نہ کی گئی اور کسی دوسرے شخص سے یہ اسامی پُر کر دی گئی۔ نسطوریس کو انطاکیہ سے نکال کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیج دیا گیا جہاں اُس کے دوستوں کا پہنچنا محال تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۴۰ء میں نسطوریس اپنی بدنصیبیوں، اذیتوں اور بدسلوکیوں کی وجہ سے لقمۂ اجل ہو گیا۔ ۴۴۴ء میں سیرل بھی جو اس سارے معاملے کا ممتاز محرک تھا فوت ہو گیا۔

اِفسس کی دوسری کونسل[1] ۴۴۹ء

پانچ سال کے بعد ۴۴۹ء میں ایک شخص بنام یوٹیکس (EUTYCHES) نے جو اسکندریہ کے ایک راہب خانہ کا صدر تھا، مسیح کی دو فطرتوں کے مسئلہ کے خلاف (جسے اب نسطورین ازم کہا جاتا تھا) تعلیم دینی شروع کر دی۔ اُس نے یہ تعلیم دینی شروع کی کہ ہمارے خداوند کی انسانی فطرت اُس کی الٰہی فطرت میں معدوم ہو گئی تھی جس طرح سرکے کا ایک قطرہ سمندر میں کھو جاتا ہے۔ لہٰذا خداوند کی "الٰہی انسانی فطرت" تمام مخلوقات سے جُدا تھی۔ اس مسئلہ کو مانوفسی ٹزم[2] کہا گیا ہے۔ یہ لفظ دو یونانی الفاظ کا مرکب ہے جس کا مطلب "واحد"

ف[1] SECOND COUNCIL OF EPHESUS.

ف[2] MONO PHYSITISM.

اور "فطرت الٰہی" ہے۔ اُسقفِ اعظم فیلیوین[1] نے اس تعلیم کی تصدیق نہ کی لیکن یوٹیکس کے دوست بارسوخ لوگ تھے انہوں نے اُس کا ساتھ دیا چنانچہ بمقام افسس ایک دوسری کونسل کا اہتمام کیا گیا تاکہ مسئلہ زیرِ بحث کی سماعت و تحقیق کی جائے۔

اسکندریہ کا اُسقف جو سیرل (CYRIL) کا جانشین بنا تھا کونسل مذکورہ میں آیا۔ وہ اوٹیکس کا ہم خیال تھا کیونکہ اوٹیکس نسطوری لوگوں کے خلاف تھا۔ اس کے برعکس اُسقفِ اعظم فلیوین اوٹیکس کے خلاف تھا اور اُس کی مخالفت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ نسطوری لوگوں کے خلاف تھا بلکہ اُس کا یہ اعتقاد تھا کہ "الٰہی، انسانی فطرت[2]" کا تصور قطعی طور سے غلط ہے۔ اس موقع پر پوپ[3] لیو اوّل اس کونسل میں شرکت نہ کر سکا کیونکہ یہ ایسا موقع تھا جبکہ روما کی وحشی اقوام کی طرف سے حملوں اور مصیبتوں کا ایک بڑا بھاری خطرہ نظر آ رہا تھا۔ پوپ لیو نے ایک طویل مکتوب کونسل کے نام روانہ کیا جس سے اُس نے مسئلہ زیرِ بحث پر اپنا بیان دیا اور فلیوین کی حمایت کی۔ اس مکتوب کو "ٹوم آف[4] لیو" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

افسس کی دوسری کونسل کلیسیائی انتشار و پراگندگی کا ایک ہولناک نظارہ تھی بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ کلیسیائی انتشار سے بھی بدتر حالت کا فوٹو تھا۔ اس کونسل میں اسکندریہ کا بشپ اپنے ہمراہ راہبوں کا ایک گروہ لایا تھا، جو وحشی لوگوں کی طرح سرکش اور غیر متمدن تھے۔ وہ بلا میل و حجت اپنے بشپ کے فرمان کی تعمیل کرنے کے عادی تھے۔ اس موقع پر حفظِ امن کے لئے

---

[1] PATRIARCH FLAVIAN. [2] MONO PHYSITISM.

[3] THE POPE LEO. [4] THE TOME OF LEO.

شہنشاہ روم نے چند سپاہیوں کو بھیج رکھا تھا اور انہوں نے بھی اسکندریہ کے بشپ کے حکم کی تعمیل کی۔ بشپ مذکورہ نے اُن سپاہیوں کو اس غرض سے بلایا تھا کہ کونسل کو ڈرایا دھمکایا جائے۔ اُس نے مطالبہ کیا کہ باقی کے سب بشپ ایک دستاویز پر اپنے اپنے دستخط ثبت کریں اور اس دستاویز کی بنا پر یوٹیکس کو بے جرم قرار دیا جائے اور فلیوین کو مجرم ٹھہرایا جائے لیکن اس پروگرام کا یہ نتیجہ نکلا کہ کونسل میں بلوہ ہوگیا۔ فلیوین بچارے کو اتنی بے رحمی سے مارا پیٹا گیا کہ وہ بعد ازاں جاں بحق ہوگیا۔ دیگر بشپوں نے کونسل سے فرار ہونے کی کوشش کی بلکہ اُنہوں نے بنچوں کے نیچے چھپنے کی سعی بھی کی لیکن انہیں کھینچ کھینچ کر باہر نکالا گیا اور اُن کی خوب زدوکوب کی گئی اور مذکورہ دستاویز پر اُن سے بالجبر دستخط حاصل کیے گئے۔ پوپ کا پیغامبر جو اُس کا مکتوب لے کر کونسل میں آیا تھا جب واپس لوٹا تو اُس نے پوپ کو کونسل کے تمام حالات و کیفیات سے مطلع کیا۔ پوپ لیو کو اس خبر سے شدید صدمہ پہنچا اور اُس نے کہا کہ یہ کونسل کسی طرح بھی ایک درست کونسل قرار نہیں دی جاسکتی۔ اس کونسل کا ایک ہی نام ہو سکتا ہے یعنی ”ڈاکوؤں کی کونسل“۔ اُس دن سے اس کونسل کو ڈاکوؤں کی کونسل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چالسیڈون کی کونسل ۴۵۱ء[۵]

اس واقعہ کے بعد ہی شہنشاہ تھیوڈوسیس کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد اُس کی ہمشیرہ تخت نشین ہوئی۔ ۴۵۱ء میں اُس نے کونسل آف چالسیڈون کا اہتمام کیا۔ اس کونسل نے اپنی تمام گذشتہ کارگزاریوں کو اُلٹ دیا اور

۵؎ COUNCIL OF CHALCEDON. 451.

دوبارہ کیتھولک تعلیم کا اعلان کیا کہ ہمارا خداوند ایک کامل خدا اور کامل انسان ہے اور ان دونوں فطرتوں میں سے ایک بھی دوسری میں مخفی نہیں ہوتی۔

نسطوری اور مونوفیزائٹ طبقہ

مشرقی کلیسیائیں ابھی تک اس بدسلوکی کے لئے جو نسطوری طبقہ کے حق میں کی گئی اور سلطنت کی کلیسیاؤں کے اختیار واقتدار کے معاملہ میں برتی گئی تھی غصہ سے لال پیلی ہو رہی تھیں۔ مصر کا مونوفیزائٹ طبقہ قسطنطنیہ پر رومی حکومت سے متنفر تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نسطوری اور مونوفیزائٹ لوگوں نے سلطنت کی کلیسیاؤں کے ساتھ اور آپس میں اپنی شرکت کو منقطع کر دیا۔ شہنشاہ روم نے مختلف پارٹیوں میں ملاپ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکامیاب ہوا۔ نسطوری اور مونوفیزائٹ لوگوں کے باہمی جھگڑوں نے مشرقی کلیسیاؤں میں تفریق پیدا کر دی۔ یہ دونوں گروہ شاہی طبقہ یا شہنشاہ کے آدمیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مشرقی لوگوں نے لفظ "میلائی کائٹ"¹ سلطنت کی کلیسیاؤں پر چسپاں کر رکھا تھا۔ کیونکہ وہ عوام کے خیال کے مطابق محض کلیسیا کے شرکا ہی نہ تھے بلکہ وہ شہنشاہ روم کے حامی و مددگار بھی تھے۔

"خدا کی پیروی کرو۔ اگر خدا کی پاک مرضی ہے کہ تمام بنی نوع انسان نجات پائیں تو یہ بات معقول ہے کہ ہم سب کے لئے دعا کریں . . . . آپ غیر یہودی لوگوں کے لئے دعا مانگنے سے خائف نہ ہوں کیونکہ خدا خود اس بات کا متمنی ہے۔ لہٰذا آپ دوسروں کے خلاف دعا مانگنے سے خائف ہوں۔

---

¹ MELAKITES

کیونکہ وُہ ایسی بات پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ بُت پرستوں کے لئے دُعا مانگتے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ آپ بدعتی لوگوں کے لئے بھی دُعا مانگیں کیونکہ ہمیں تمام بنی نوع انسان کے لئے دُعا مانگنا لازمی ہے نیز اُنہیں اذیت نہیں دینی چاہیئے"۔ (کرائزاستم ۳۴۷-۴۰۷ء)

قسطنطنیہ کا اُسقفِ اعظم۔

ساتواں باب

مغرب میں مسیحیت کی توسیع و اشاعت

زوالِ رُوم ۴۱۰ءؔ:-

ایسے وقت میں، اگر کوئی شخص مسیحی کلیسیا پر باہر سے نظر ڈالتا تو وہ غالباً اس نتیجے پر پہنچتا کہ کلیسیا نہ صرف دو حصوں میں منقسم ہو جائے گی بلکہ بالکل فنا ہو جائے گی۔ کیونکہ کلیسیا کے گرداگرد مہذب اقوام نیست و نابود ہو رہی تھیں جب پوپ لیو (POPE LEO) نے ۴۴۹ءؔ میں اپنا مکتوب (TOME) اِفسُس کی کونسل کو لکھا تھا اس وقت سلطنت کی قلعہ بندیاں ہر سمت میں ہاتھوں سے نکل رہی تھیں اور وحشی اقوام ایک سیلاب کی طرح حدودِ سلطنت میں

داخل ہو رہی تھیں۔ سنہ ۴۱۰ء میں رُوم ایک دفعہ گاتھوں کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ گاتھ لوگ وحشی تو ضرور تھے لیکن بُت پرست نہیں تھے۔ ان کو ایک مشنری بنام اُلفلاس (ULFILAS) کی معرفت انجیل جلیل کی خوشخبری سنائی گئی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی میں گاتھ لوگ اِس سرزمین میں جہاں اب جنوبی رُوس ہے بستے تھے۔ الفلاس کا خاندان اُن کے مابین قیدیوں کی حیثیت سے مقیم تھا۔ اُسے گاتھ لوگ بہت پہلے سلطنت کی حدُود سے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کا نام گاتھک تھا جس کا مفہوم "ننھا بھیڑیا" ہے۔ وہ ایک معصُوم بچّے کی حیثیت سے اُن لوگوں کے ساتھ شیر و شکر تھا۔ جب وہ عالم شباب پر پہنچا تو اُنھوں نے اُسے عُہدہ سفارت دے کر قسطنطنیہ کو روانہ کیا۔ وہ چند سال وہیں مقیم رہا۔ اُسے پہلے پریسٹ بنایا گیا اور سنہ ۳۴۱ء میں وہ ایک بشپ بنا۔ اس کے بعد وہ واپس گوتھوں کے پاس چلا گیا۔ الفلاس نے اپنی زندگی ان لوگوں کے ہاں صرف کی اور انہیں تعلیم دی۔ وہ ایک ایرین تھا اس لئے اُس کے اثر و رسُوخ سے گاتھ لوگ بھی ایرین ہو گئے۔ پانچویں صدی میں ہُن لوگوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا اور وہ اطالیہ میں آ گئے۔ اُنھوں نے مُلک پر حملہ کیا اور رُوم پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اُنھوں نے رُوم کے مسیحیوں کو اپنی مانند پایا؛ اگرچہ وہ ادنیٰ درجہ کے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اُن کی جان بخشی کی اور اُن کے گرجوں کو نہ جلایا۔ رُوم کے لوگ اپنی اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اس حقیقت نے کہ رُوم پر زوال آنا ممکن ہے سلطنتِ رُوم کی بُنیادوں کو ہلا دیا۔

ہن[1] ۴۵۲ء :-

ہن ۴۵۲ء میں یعنی چالسیڈون[2] کی کونسل کے ایک سال کے بعد زیادہ خطرناک دشمن ظاہر ہوئے۔ یہ ہن لوگوں کا لشکر تھا جس نے گاتھوں کو سرزمین روس سے بھگا دیا تھا اور اب اطالیہ میں نمودار ہوئے تھے۔ جو کچھ اُن کی راہ میں نظر آیا اُسے اُنہوں نے سپردِ آتش کیا اور لوٹ کھسوٹ کر کے اور ملک کو برباد کر کے چلے گئے۔ ان کے بادشاہ کا نام اطیلا (ATTILA) تھا جب وہ رُوم کے قریب پہنچا تو پوپ لیو نے شہریوں کا ایک جلوس تیار کر کے شہر سے باہر آیا اور اطیلا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ نقدی کی شکل میں ایک معقول تحفہ لیکر رُوم سے روانہ ہو جائے۔

وندالا ۴۵۵ء (THE VANDALAS. 455)

اطیلا واپس چلا گیا لیکن تین سال کے بعد یعنی ۴۵۵ء میں وندالا چلا آیا اور رُوم سے لوٹنے پر رضامند نہ ہُوا بلکہ شہر کو قبضہ میں لے کر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دیا۔ اس وقت کلیسیا ہی واحد طور پر مصیبت زدہ لوگوں کی معاون و مددگار تھی۔ شہنشاہ تو وہاں سے بہت دور قسطنطنیہ میں اپنی ذاتی مشکلات میں پھنسا ہُوا تھا اور عوام کو امداد دینے سے معذور تھا۔ اس وقت درحقیقت سلطنت منقسم ہو چکی تھی اور سلطنت کے دو بادشاہ تھے ایک مشرق کے لئے قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور دوسرا مغرب کے لئے اطالیہ میں بمقام ریوانا رہتا تھا۔ اس مغربی بادشاہ کی بہت کم وقعت تھی۔ ۴۷۶ء میں موخرالذکر بادشاہ اپنے تخت و تاج سے دستبردار ہو

---

[1] HUNS. 452. [2] THE COUCIL OF CHALCEDON.

گیا۔ پچاس سال کے عرصہ تک یعنی ۴۷۶ء سے ۵۲۷ء تک ماسوائے پوپ کے کوئی بھی شخص نہ تھا جو عوام الناس کی امداد کرتا۔

ہم نے کتاب ہذا کے تیسرے باب میں رومی سلطنت کو ایک باغ سے تشبیہ دی ہے جس میں شیر خوار کلیسیا پل کر جوان ہوتی تھی۔ اب اس باغ کی باڑ توڑ دی گئی تھی اور وحشی لوگ باہر سے نرغہ کرکے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن اس طوفانِ بد تمیزی میں یہ شیر خوار بچہ نہ مرا۔ وہ خود بخود اپنے معصوم پاؤں پر کھڑا ہوا اور رومی باغ کی تباہ شدہ باڑیں سے باہر نکل گیا تاکہ وحشی اقوام کو پیغامِ بشارت دے۔

مغرب میں مشنیں:۔

پانچویں صدی کے دوران میں رومار زوال آیا۔ تقریباً پانچسو سال کے بعد دسویں صدی میں مغرب کو پیغامِ بشارت دیا گیا۔ لیکن اہلِ مغرب کو نہ تو تبدیلیٔ زندگی یا نئی پیدائش کا احساس ہوا اور نہ ہی ابھی تک اُن میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ الغلاطیوں کے بعد ارضِ مغرب کا پہلا جلیل القدر مشنری پیٹرک (PATRICK) تھا۔ وہ اُس کلیسیا کا ایک پیدائشی رکن تھا جس کا سنگ بنیاد رومی آبادکاروں کے ہاتھ سے برطانیہ میں رکھا گیا تھا۔ مذکورہ کلیسیا غالباً پہلی صدی میں قائم کی گئی تھی لیکن ہم یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ جب پانچویں صدی میں انگلش لوگ ملک پر حملہ آور ہوئے تو اُنہوں نے برطانیہ کے مسیحیوں کو ویلز اور کارنیوال کی پہاڑیوں میں دھکیل دیا اور ملک کے زرخیز علاقوں پر قابض ہو گئے۔ وہ ہنوز مشرک اور وحشی تھے۔ پیٹرک غالباً ویلز میں رہتا تھا۔ اُسے بحری ڈاکو اُٹھا کر لے گئے اور ایک غلام کی حیثیت سے اُسے آئرلینڈ

میں بیچ دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ وہاں سے فرار ہوگیا اور فرانس میں پہنچا یہاں وہ ایک راہب خانے میں داخل ہوا اور اچھی خاصی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں وہ واپس آئرلینڈ میں چلا آیا اور اُس نے انجیل مقدس کی حیات بخش بشارت ان لوگوں کو دی جن کے مابین وہ ایک غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کر چکا تھا۔ اُس نے آئرلینڈ کی کلیسیا کی بنیاد رکھی جو بہت جلد ایک عظیم المرتبت مشنری کلیسیا بن گئی۔ اُس نے ۴۶۱ء میں وفات پائی۔

بینیڈکٹ ۴۸۰-۵۴۴ء (BENEDICT)

اسی دور میں بینیڈکٹ اطالیہ میں رہتا تھا۔ وہ بذاتِ خود ایک مشنری نہ تھا لیکن اُس نے راہبوں کے ایک حلقہ کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ راہب انجیل مقدس کو ان ممالک سے دور دراز اور خطرناک حصص میں لے گئے جنہیں موجودہ زمانے میں آسٹریا، جرمنی، ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کہا جاتا ہے۔ اس حلقہ کی قوت زیادہ تر بینیڈکٹ کی حکمت عملی پر مبنی ہے اُس نے اپنے مریدوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ اپنے جاگنے کے اوقات کو یکساں طور پر عبادت، مطالعہ، اور دستکاری میں تقسیم کریں۔

کلووس کا اصطباغ (BAPTISM OF CLOVIS. 496)

پانچویں صدی میں کلووس، فرینکوں کے بادشاہ نے جو مرکزی یورپ میں مقیم تھا مسیحیت کو قبول کر لیا (۴۹۶ء)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے یہ قدم اس خیال سے اُٹھایا تھا کیونکہ اُس نے خیال کیا کہ مسیحیت ایک فتح کرنے والا مذہب ہے۔ بعد ازاں اُس کی زندگی مسیحیت سے بہت دور ہوگئی۔

اس کے باوجود یہ حقیقت کہ کلودِس اپنے آپ کو ایک مسیحی کہتا تھا جس کے باعث مشنریوں کے لئے یہ کام آسان ہو گیا کہ وہ عوام میں کام کریں اور اگلی پشت کو مسیحی دستورات میں تعلیم و تربیت دیں۔ کلیسیا عام طور پر اپنی وقتی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے اپنے بلند ترین معیاروں سے نیچے کی طرف جھکتی رہی ہے۔ ہم یہ بیان کرنے سے قاصر ہیں کہ کلیسیا کا احوال کیا ہوتا اگر وہ کسی اور طریق سے عمل کرتی اور ہر ایک شخص کو جو مسیحی زندگی بسر کرنے کے لئے مستعد نہ ہوتا بپتسمہ دینے سے انکار کرتی۔ کلیسیا کو بہت سی باتیں سیکھنی تھیں اور یہ بات شاید اُن میں سے ایک تھی۔

کولمبا اور آگسٹین (COLUMBA AND AUGUSTINE) 521-597

چھٹی صدی میں کولمبا آئرلینڈ کی کلیسیا سے سکاٹ لینڈ میں آیا اور اس ملک میں بمقام آیونا (IONA) ایک راہب خانے کا سنگ بنیاد رکھا۔ بعد ازاں اس راہب خانے کے راہب جنوب کی سمت میں انگریزوں کو بشارت دینے کے لئے گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد راہبوں کا ایک اور گروہ انگلستان میں پہنچا جسے مایۂ ناز مشنری پوپ گریگری اوّل نے بھیجا تھا۔ وہ آگسٹین کی زیرِ قیادت ملک کے جنوبی حصہ میں پہنچے اور یوں آگسٹین کنٹربری کا پہلا آرچ بشپ مقرر ہوا۔ (۵۹۷ء) اسی طرح قدیم انگلستانی کلیسیا، آئرلینڈ کی کلیسیا اور کلیسیائے رُوم نے متحد ہو کر کلیسیائے انگلستان کو وجود دیا۔

وِلی براڈ، بونی فیس اور انسکار (WILLI BROD, BONIFACE AND ANSKAR.)

اس کلیسیا نے یعنی کلیسیائے انگلستان نے فوراً ہی وِلی براڈ کو ایک

مشنری کی حیثیت سے اُس ملک کی طرف روانہ کیا جو دریائے رائن (RHINE) کے دہانہ پر آباد تھی۔ یہ مقام آجکل بلجیم کہلاتا ہے۔ بعد ازاں اس کلیسیا نے بونی فیس کو اُس ملک کی جانب بھیجا جو دریائے رائن کے شمال میں واقع تھا اسے اب جرمنی کہتے ہیں۔ ایک کہانی میں بیان کیا گیا ہے کہ بونی فیس ایک مقام پر آیا جہاں ایک بڑا درخت تھا۔ عوام کا خیال تھا کہ وہ درخت ایک دیوتا کی جائے رہائش تھی اور اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر وہ اس درخت کی ایک ٹہنی بھی توڑنے کی جُرات کرے گا تو مذکورہ دیوتا بونی فیس کو قتل کر دے گا۔

.... بونی فیس نے لوگوں کو جواب دیا کہ اُس کا خدا اُن کے دیوتا سے قوی ہیکل ہے اور اس دعوٰی کے ثبوت میں اُس نے درخت کو کاٹ ڈالا۔ شروع میں تو لوگ خوفزدہ ہو گئے لیکن جب اُنہوں نے معلوم کیا کہ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تو اُنہوں نے ہمت سے کمر باندھی اور درخت کو چیر کر تختے بنائے اور ایک گرجا تعمیر کرنے میں اُس کی مدد کی۔

نویں صدی میں آنسکار (تاریخ وفات ٨٦٢ء) ڈنمارک کو روانہ ہوا اور وہاں سے انجیل کی خوشخبری سویڈن، ناروے اور آئس لینڈ کی طرف پہنچ گئی۔

شارلی مین (CHAREMAGNE) 766-814

آٹھویں صدی کے اختتام پر فرینک قوم پر ایک جلیل القدر بادشاہ حکمران تھا جو مسیحیت کا پیرو تھا اور کلووس سے بدرجہا بہتر تھا۔ اُس کا نام شارلی مین یعنی چارلس اعظم تھا۔ وہ مرکزی حکومت کے ایک وسیع علاقہ پر حکمران تھا اور اُس کے علاوہ اُس نے پوپ کو اُن وحشی اقوام کے خلاف امداد دی تھی جو اطالیہ میں بس گئے

تھے۔ ۸۰۰ء میں وہ کرسمس کے روز روما کے گرجا گھر میں حاضر تھا جب عبادت ختم ہوگئی تو پوپ اُس کے پاس آیا اور جونہی شارلیمین اُس کے رُوبرُو دو زانو ہوا تو پوپ نے اس کے سر پر ایک تاج رکھ دیا اور اس امر کا اعلان کر دیا کہ وُہ رُومی سلطنت کا بادشاہ ہے۔ ہم اس نئی سلطنت کے متعلق کتاب کے اگلے باب میں مزید معلومات پائیں گے۔ شارلیمین یورپ کے سب سے جلیل القدر بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس کی حکومت تاریک زمانہ کے اختتام پر قرون وسطیٰ کے اختتام کا ایک نشان ہے۔ وُہ فنونِ لطیفہ کا ایک زبردست شیدائی تھا اور اُس کا دربار علم و ہنر کا مرکز تھا۔ افسوس وُہ یہ سمجھتا تھا، جیسے کہ ان ایام میں کلیسیاء تصور کرتی تھی، کہ عوام الناس کو بزورِ شمشیر جبر و تشدد سے مسیحی بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب اُس نے سیکسنی (SAXONY) فتح کیا جو ابھی تک ایک بُت پرست یا مشرک اور وحشی ملک تھا اور جرمنی کا ایک حصہ تھا، تو اُس نے سیکسن لوگوں کو حکم دیا کہ وُہ بپتسمہ اور موت دونوں چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے بپتسمہ کو چنا لیکن اُنہوں نے اپنے قلوب میں غصہ اور ندامت کے جذبات رکھتے ہوئے یہ قدم اُٹھایا اور یُوں نام نہاد مسیحی بنے۔

ولاڈیمر (VLADIMIR)

دسویں صدی میں انجیل کی خوشخبری رُوس میں پہنچ گئی۔ رُوس کے پہلے فرمانروا کا نام ولاڈیمر تھا وُہ کیو (KIEV) کے شہر میں حکمران تھا۔ یہ مقام موجودہ خطہ رُوس کے وسط میں تھا۔ وُہ اس پس و پیش میں تھا کہ آیا اُسے پوپ کے ماتحت آنا چاہیئے یا اُسقفِ اعظم کی فرمانروائی کے ماتحت۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں

اُس نے دُوسرے خیال کو پسند کیا کیونکہ وُہ قسطنطنیہ کے گرجا کی عبادتوں کے حیرت انگیز حسن و جمال اور سلیقہ و تنظیم سے متاثر ہو چکا تھا۔ ان عبادتوں سے واقعی ایک عابد فردوس بریں میں داخل ہو جاتا ہے۔

مشرقی اور مغربی کلیساؤں کی فرقہ بندی ۱۰۵۴ء

ان پانچ صدیوں میں جبکہ یورپ کو انجیل مقدس کی بشارت دی جا رہی تھی مشرق و مغرب کی کلیسیائیں یعنی قسطنطنیہ اور رُوم کی کلیسیائیں ایک دُوسرے سے دُور ہٹ رہی تھیں۔ اس کی بے شمار وجوہات تھیں جن میں سے ایک رقابت تھی۔ ایک شہر دُوسرے شہر کی تحقیر کرتا تھا اور اپنے رقیب شہر کے اس دعویٰ کو ناپسند کرتا تھا کہ وُہ دُنیا عالم کا اوّل و اعلیٰ شہر ہے۔

مزید برآں اب یُونانی زبان دونوں ممالک کی مشترکہ زبان نہ رہی تھی جیسے کہ پہلی صدی میں تھی۔ لاطینی زبان پھر سے رواج پا گئی تھی اور عوام اب ایک دُوسرے کے خیالات کو اتنی اچھی طرح نہ سمجھتے تھے جتنا کہ وُہ پہلے سمجھتے تھے۔ مختلف مسائل و معاملات میں اُن کے رسم و رواج مختلف تھے۔ اہلِ رُوم نے اس امر کا تصفیہ کر لیا تھا کہ اُن کے مذہبی پیشواؤں کو شادی بیاہ کی مخالفت تھی، حالانکہ یُونانی کلیسیا میں پریسٹ مسلسل طور سے شادی شدہ ہوتے تھے تاہم بشپ صاحبان کبھی بھی شادی شدہ نہیں تھے۔ نیز اہلِ رُوم اور اہلِ یُونان ایسٹر یا عیدِ قیامت کو منانے کے معاملہ میں موزوں دن کے متعلق اختلاف رائے رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں اہلِ رُوم پاک شراکت میں بے خمیری روٹی کا استعمال کرتے تھے اور یُونانی لوگ خمیری روٹی کا استعمال کرتے تھے۔

ان میں ایک اختلاف عقیدہ کے متعلق تھا۔ وُہ چالسیڈون کی کونسل میں

پڑھا گیا تھا۔ یہ بیان کرتا ہے کہ :۔

"ہم ایمان رکھتے ہیں رُوح القدس پر جو باپ سے صادر ہے"

(ملاحظہ فرمائیں یُوحنا ۱۴: ۱۶، ۲۶)

سرزمین مغرب میں اور بالتخصیص سپین کے ملک میں ایرین لوگوں (THE ARIANS) سے بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ کیتھلک نقطۂ نظر کو اپنا چکے تھے اور باپ اور بیٹے کے اتحاد پر زور دینے کا یہ رواج تھا کہ عقیدہ میں "اور بیٹا[1]" کے الفاظ کا اضافہ کیا جاتا تھا۔

(ملاحظہ ہو یُوحنا ۱۵: ۲۶، ۱۶: ۷)

ان الفاظ کو ٹالڈیو[2] کی کونسل میں (ٹالڈیو سپین کا ایک شہر ہے) عقیدے کے ساتھ تحریری صُورت میں شامل کیا گیا تھا۔ پوپ نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ عقیدہ یُوں کا تُوں رہنا چاہیئے جیسا کہ وُہ چالسیڈون کی کونسل میں تھا لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ یہ رواج جاری رہا اور پوپ کے اعتراضات کم ہوتے گئے۔ آخر کار دو سال سے کچھ زائد عرصہ کے بعد شارلی مین نے اصرار کیا کہ ان الفاظ کو عقیدہ کا حِصّہ قرار دینا چاہیئے۔ پوپ اس تجویز پر رضا مند ہو گیا اور مغرب میں یہ الفاظ آج کے دن تک عقیدہ میں شامل ہیں۔ لیکن مشرقی کلیسیا نے کبھی بھی ان الفاظ کو قبُول نہیں کیا۔

مشرقی کلیسیا بھی ایک طویل اور دلخراش بحث کی وجہ سے جو تصویروں اور مجسّموں پر ہُوئی منقسم اور کمزور ہو چکی تھی۔ یہ بحث ایک صدی سے زائد عرصہ تک جاری رہی اور یہ مغرب کے ساتھ اس اختلاف کی خلیج کو اور بھی وسیع کرنے میں ممد ثابت ہُوئی۔

---

[1] AND THE SON [2] COUNCIL OF TALEDO · 589

مذکورہ بالا کلیساؤں کے رشتہ و تعلق کی آخری تار ایک چھوٹی سی بات سے ٹوٹ گئی۔ دراصل وہ سب باتیں جن پر ہم نے غور و خوض کیا ہے مسیحی اتحاد و یگانگت کے عظیم المرتبت فرض کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ قسطنطنیہ میں بعض کلیساؤں نے رومی رواجات کی پیروی کی اور روما میں چند کلیساؤں نے یونانی رواجات کو اپنایا۔ قسطنطنیہ میں شہنشاہ نے حکم فرمایا کہ رومی گرجوں کو بند کر دیا جائے۔ اس پر پوپ نے صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے اپنے سفیر بھیجے لیکن اُن کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ آخر سفیروں نے ایک خط قلمبند کیا اور اسبات کا اعلان کیا کہ مشرق و مغرب کی شراکت منقطع کر دی گئی ہے۔ انہوں نے اس خط کو سینٹ صوفیاء کے گرجے کی قربان گاہ پر رکھ دیا اور واپس لوٹ گئے (سنہ ۱۰۵۴ء) لیکن اس اَن بَن کا زخم کبھی بھی ہرا نہ ہو سکا۔

"چونکہ مجھ کمزور اور ناقابل شخص نے ایک جہاز کو اپنی تحویل میں لیا ہے۔ جو پرانا ہے اور افسوسناک طریق سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اس میں ہر سمت سے لہریں داخل ہو رہی ہیں اور اس کے گلے سڑے تختے جو ہر روز شدتِ طوفان کی ٹکریں کھاتے ہیں اور جہاز کی پائمالی پیدا کر رہے ہیں، میں تم سے خدا قادرِ مطلق کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے دستِ دعا کو میری مصیبت میں میری اعانت کے لئے بڑھاؤ ......"

۵۹۰ء میں گریگری اوّل نے جب وہ بشپی منصب کے لئے منتخب کیا گیا تو مندرجہ بالا الفاظ میں یوحنا کو جب وہ قسطنطنیہ کا اسقفِ اعظم تھا، تحریر کیا۔ اس وقت کلیسیا عام طور پر تباہی و بربادی کی منزل تک پہنچتی ہوئی نظر آتی۔ لیکن اس کا جہاز ابھی تک تیر رہا اور اپنی منزل کی جانب جا رہا تھا

دکھائی دیا۔ مقدسین سے ابھی تک دعا کی جاتی ہے کہ وہ کلیسیا کے لئے دعا کریں۔

آٹھواں باب

طلوعِ اسلام

ساتویں صدی :-

ساتویں صدی میں مرکزی یورپ ابھی تک انجیل کی خوشخبری سے مانوس نہیں ہوا تھا۔ برطانوی جزائر کے تقریباً نصف حصہ میں بشارت دی گئی تھی اور مسیحیت پہلی مرتبہ ملک چین میں پہنچ رہی تھی (اس حقیقت کا جائزہ تیرہویں باب میں لیا جائیگا) روم اور قسطنطنیہ کے باہمی تعلقات ناخوشگوار ہو چکے تھے لیکن ابھی تک انہیں ایک دوسرے سے شراکت منقطع کرنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ اس صدی میں مشرقی کلیسیاؤں کو باہمی شراکت کا ایک بیش بہا موقع ہاتھ لگا اور یہ موقع پھر ہاتھ سے نکل گیا کیونکہ وہ رہنما میں مستعد نہ تھے۔

مشرقی کلیسیائیں :-

ایران کی نسطوری کلیسیائیں، ابی سینا کی مونوفزائٹ کلیسیا (جس کو چوتھی

صدی میں بشارت دی گئی تھی) مسوپوتامیا اور عربستان کی ملی جلی کلیسیائیں ، مذہبی مطالعہ ، کلام اللہ کا مطالعہ اور مسیحی زندگی کی مشق کی بجائے ، زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ اور ملا کائٹ لوگوں کے ساتھ جو ان کے مابین بستے تھے ، بحث و مباحثہ میں منہمک تھیں ۔ ان کلیسیاؤں کی ایک بدقسمتی یہ تھی کہ انہوں نے کتاب مقدس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں نہیں کیا تھا ۔ وہ سریانی ترجمہ کو استعمال میں لاتی تھیں ۔ سریانی ترجمہ ایک امتیازی وقعت رکھتا تھا ۔ کیونکہ سریانی زبان باقی تمام زبانوں کے مقابلے میں آرامی زبان کے قریب تر تھی ۔ اس زبانِ مبارک کو ربنا المسیح روزمرہ کے استعمال میں لاتے تھے ۔

عربوں نے اتنی تکلیف گوارہ نہ کی کہ کتاب مقدس کا سریانی زبان میں مطالعہ کرتے یا اس کا ترجمہ کرتے بلکہ اس کی بجائے وہ اپوکریفا کی اناجیل کی خیالی کہانیوں سے دل بہلاتے رہے ۔ یہ کتابیں خیالی تصنیفات تھیں جن میں کوئی تواریخی واقعات نہ تھے ۔ ان کا کثیر التعداد حصہ ہمارے خداوند کے زمانہ کے بعد قلمبند کیا گیا تھا ۔

اس دور کے مسیحی لوگ اوہام پرستی میں مبتلا ہو چکے تھے ۔ ان ممالک کی کلیسیا جس نے چوتھی اور پانچویں صدیوں میں ایک زبردست گواہی دی تھی ، اب ساتویں صدی میں گواہی دینے کے لئے تیار نہ تھی یا یوں کہیں کہ وہ گواہی دینے کی اہلیت نہ رکھتی تھی ممکن ہے کہ کلیسیا مذکورہ ان اذیتوں کے باعث جس کا وہ شکار بن چکی تھی پنپ نہ سکی ۔ اس وقت اس کے فائدین اور بہترین شرکا مر چکے تھے ۔ تاہم جب وہ موقع آیا جس میں اس کی گواہی کی خاص طور پر ضرورت تھی تو وہ گواہی دینے کے لئے تیار نہ تھی ۔

وہ وقت تب آیا جب محمد صاحب (۵۷۱ - ۶۳۲ ء) مکہ میں سرزمین

عربستان میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک مشرک قوم کا متبرک شہر تھا جہاں ایک سیاہ پتھر (سنگِ اسود) کی لئے عبادت کی جاتی تھی۔ یہ پتھر ایک عمارت کی دیوار میں استادہ تھا جس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ محمدؐ صاحب کے قبیلہ کے لوگ اس پتھر کے محافظ تھے۔ چالیس سال کی عمر تک آپ اپنے قومی مذہب کے پابند رہے۔ آپ ایک سوداگر تھے اور عربستان کے تمام حصص میں، سیریا اور شمال میں دمشق سے جنوب میں یمن تک سفر کیا کرتے تھے۔ ان سفروں میں وُہ یہودیوں اور مسیحیوں کو ملا کرتے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں آپ نے محسوس کیا کہ آپ کو خدا کی طرف سے بلاہٹ ہوتی ہے۔ آپ نے اپنے اہلِ وطن کو بُت پرستی، بدکرداری کے خلاف اور ضرورتِ راستبازی اور قیامت کے ایقان پر منادی کی۔ انہوں نے آپ کا پیغام سننے سے کان بند کر لئے۔ ۶۲۲ء میں آپ مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ یہاں آپ نے ایک اُستاد اور قائد کی حیثیت سے تعلیم دی۔

اگر ان حالات میں آپ ایک زندہ اور متحدہ کلیسیا کے اثر میں آجاتے اور کلمۃ اللہ کی زندگی، موت اور قیامت کے حقائق کو جان لیتے تو تواریخ کلیسیا اور تواریخِ عالم کسی اور رنگ میں لکھی جاتی۔

اسلامی فتوحات سنہ ۶۲۲-۷۳۲ء:-

علم تاریخ کے مطابق، حضرت محمدؐ صاحب عربی مذہب اسلام کے بانی تھے۔ آپ نے واحدہٗ لاشریک کی تعلیم دی اور عربوں اور غیر عربوں کو دعوت اسلام بھی دی جب مکہ فتح کر لیا گیا اور حرم کعبہ میں مشرکوں کا داخلہ بند کر دیا گیا تو عربوں کو یقین ہو گیا کہ اسلام بُت پرستی کے خلاف ہے۔ آپ کے آخری حج کے وقت اسلام

تمام عرب ستان میں پھیل چکا تھا۔ آپ ۶۳۲ء میں وفات پا گئے۔ دو حریف پارٹیوں کے مابین تقسیم و رقابت کے باوجود آپ کا کام آپ کے جانشینوں کے وسیلے جاری رہا۔ مسلمانوں نے دنیا کو فتح کرنے کی ابتدا کی اور رومی اور ایرانی حکومتوں کے ممالک کو فتح کیا۔ وہ شمال کی طرف بڑھے اور سیریا، جس میں یروشلم شامل تھا، رومی شہنشاہ سے فتح کیا۔ انہوں نے میسوپوٹامیہ اور ایران کو تخت و تاراج کیا۔ انہوں نے اس وقت سرزمین ہند پر حملہ نہیں کیا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد (۷۱۱ء میں) وہ یہاں بھی آئے۔ وہ جنوب اور مغرب کی سمتوں میں گئے اور مصر، شمالی افریقہ اور مراکو تک قابض ہو گئے۔ انہوں نے بعد ازاں آبنائے جبرالٹر کو عبور کیا اور تقریباً کل ہسپانیہ (SPAIN) پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے مسیحیوں کو شمال میں پیرینین پہاڑ (PYRENEAN MOUNTAIN) کے دامن تک بحیرہ بسکے (BAY OF BISCAY) کے ساحل تک دھکیل دیا۔ وہ پیرینین کو عبور کر کے فرانس میں گھس گئے اور اگر وہ قسطنطنیہ پر قابض ہو سکتے اور وہاں سے مغرب کی سمت میں بڑھ جاتے تو وہ اغلباً بحیرہ روم کو چاروں طرف سے گھیر لیتے لیکن یہ بات عمل میں نہ آئی۔ فرینکوں کے جرار نے جس کا نام چارلس ہیمر (CHARLES THE HAMMER) تھا اور وہ شارلیمین کا دادا تھا، انہیں ۷۳۲ء میں پوئیٹیرز کی جنگ (BATTLE OF POICTEERS) کے موقع پر فرانس سے نکال دیا۔ ۷۱۸ء میں قسطنطنیہ کا محاصرہ ناکامیاب رہا۔

عربوں کا تمدّن

تاہم اُن کے پاس ایک عظیم ترین سلطنت تھی جس میں انہوں نے ایک

زبردست تمدن کی داغ بیل ڈالی۔ ایامِ جنگ کے بعد وہ ظالم فاتحین نہیں تھے۔ مُشرک یعنی مسیحی اور یہودی لوگ ادنیٰ صفات کے مالک گردانے جاتے تھے اور اُنہیں بہت بڑے ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے اور اُنہیں اجازت تھی کہ وہ اپنے کاروبار اور مذہب کو جاری رکھیں۔ نسطوری اور مونوفزائٹ کے مابین اکثر لڑائیاں رہتی تھیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ میل جول پیدا کرنے کی بجائے وہ حکومت کو ترجیح دیتی تھیں۔

ابھی تک اُن میں قدیم یونانی ــــ اثرات پائے جاتے تھے خاص طور پر مشرقی ممالک میں یعنی میسوپوتامیہ اور ایرانی شہروں میں عربوں نے یونانی علم و ہنر کو مفتوح لوگوں سے سیکھا تھا۔ وہ ذکی الفہم شاگرد ثابت ہوئے۔ وہ بہت جلد حساب، ادبیات، تعمیرات، شاعری، نقاشی اور میدانِ جنگ میں ہمت و استقلال کے لئے مشہور و معروف ہو گئے۔

مسیحی اور مسلمان :۔

چار صدیوں تک مسیحی اور مسلمان باہم مل جل کر ہمسائیوں کی طرح اور کسی حد تک دوستوں کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔ مسیحیوں نے اس موقع سے استفادہ نہ اُٹھایا جو پہلے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اُنہوں نے ربنا المسیح کا انکار تو نہیں کیا تھا تاہم اُنہوں نے اُس کی منادی بھی نہ کی۔ بعض اوقات اُنہوں نے ایسے غلط طریق سے منادی کی کہ اُن کے الفاظ کسی بھی صاحبِ فکر کے دل و دماغ پر یقین کلی پیدا نہ کر سکے۔ اس اثنا میں مسلمان اُس نورِ صداقت کی ہدایت پہ زندگی بسر کرتے تھے جو اُنہوں نے حاصل کیا تھا۔ اور جو نورِ راہِ نجات کو کسی حد تک روشن کرتا تھا۔ وہ معلوم کر چکے تھے کہ خدا واحد ہے۔ وہ قوت کا چشمہ ہے۔ وہ مالک

ہے اور اُس کی لامحدود ذات ہم سے اعلیٰ و برتر ہے اور وُہ انسانی زندگی کی قیود سے مقیّد نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے اس کی شریعت کو قابلِ تقلید اُصولات بنایا۔ اُن کے تصوّر میں ذاتِ آلٰہی اپنی صفات میں رحیم و کریم تھی لیکن اُس کا انسانوں سے کوئی رشتہ و ناطہ نہ تھا۔ وُہ ایک آقا تھا لیکن باپ نہیں تھا۔ اُنہوں نے اختیار اقتدار اور مادی قوّت کو ایسے تحائف قرار دیا جن سے انسان خُدا سے مشابہت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے فتح و نصرت کو خُدا کے لُطف و کرم کا نشان قرار دیا۔ (مسیحی بھی ایسے ہی تصوّرات رکھتے تھے لیکن اُن کو اس کے خلاف صاف طور پر متنبہ کیا گیا تھا)

مظاہر پرست[ا] یہ خیال کرتے ہیں کہ خُدا قوّتِ حیات کی لہر ہے جس سے ساری مخلوقات زندہ ہے۔ برہمنوں کا دعویٰ ہے کہ برہم ہی گیان ہے۔ بدھوں اور دیگر مذاہب کے مُدعیان نے کہا ہے کہ ذاتِ الٰہی کو مکمل طور سے نہیں جانا جا سکتا۔ اس خیال کے مطابق خُدا نیستی ہے۔ اسلام نے اس کی ذات پاک کے متعلق یہ تصوّر پیش کیا ہے کہ وُہ ساری قوّت کا سرچشمہ ہے۔ ہم ان تصوّرات سے اتفاق نہیں کرتے۔ وُہ واحد عقیدہ جو ہم ذہن میں ہمارے سارے سوالات کا جواب دے سکتا ہے یہ بے حد سادہ بھی ہے اور بے حد مشکل بھی۔

یہ عقیدہ مقدّس یُوحنّا کا عقیدہ ہے کہ خُدا محبت ہے۔

زمانہ ماضی میں ایسے ایسے مسلمان اہلِ باطن پائے جاتے تھے اور اب بھی ہیں جو اس عقیدہ کی تلاش میں ہیں لیکن اُنہیں راسخ العقیدہ مسلمان تصور نہیں کیا جاتا۔

مسوپوتامیہ کا سب سے بڑا شہر بغداد تھا۔ یکے بعد دیگرے بڑے بڑے

ا. ANIMISTS.

ممتاز المرتبت خلفا نے وہاں حکومت کی تھی۔ ان میں سے سب سے مشہور و معروف خلیفہ ہارون الرشید تھا، جو نویں صدی میں گزرا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد، دسویں صدی میں، عبدالرحمان سوم نے ہسپانیہ میں حکومت کی۔ اس نے ایک عجیب وغریب محل تعمیر کرایا جس کا نام الحمرا تھا۔ اس محل کو رنگ آمیزی سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ اس میں سنگِ مرمر کی مرصع کاری کی ہوئی تھی اور اس میں حسین و دلکش گل و گلزار تھے۔ اس زمانہ میں ہسپانیہ کی اسلامی قوت و اقتدار عروج پر تھا۔ ان کا اسلامی عقیدہ حسبِ ذیل ہے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

نواں باب

صلیبی جنگیں!

گیارہویں صدی میں مشرقی یورپ کی اقوام تازہ تازہ جہالت اور وحشت سے نکلی تھیں۔ اور ان اقوام کے لوگ بعض باتوں میں بچوں سے مشابہ تھے۔

ان کی زندگی میں جانبازی کا کام اور مساعی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ایک جوانمرد آدمی کے لئے جنگ ہی ایک واحد ذریعہ معاش تھا۔ چنانچہ وہ لگاتار آپس میں جنگ و جدل کرتے رہتے تھے۔ اُن کے قلوب میں ربنا المسیح کی ایک گہری شخصی پُرجوش عقیدت تھی۔ اُن کی بڑی بڑی خواہشات میں سے ایک خواہش بیت المقدس کو دیکھنے اور حج پر جانا تھی جہاں ربنا المسیح نے اپنی زندگی کے دن گزارے تھے اور وفات پائی تھی اور مُردوں میں سے جی اُٹھے تھے۔

تاتاری۔ گیارہویں صدی

اس صدی کی ابتدا میں فتنہ و فساد کے آثار نمایاں ہوئے۔ سرزمین ایشیا سے ایک نئی وحشی قوم اُٹھی اور قبیلوں کے قبیلے اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ جو بہت دور شمال میں تھے جنوب کی سمت میں بڑھتے گئے۔ سب سے پہلے بلاکو خان اور غزنوی کے سلاطین آئے۔ بعدازاں سلجوقی تاتاری آئے۔ ان کے قائد طغرل بیگ نے بغداد پر قبضہ کیا اور ۱۰۵۵ء میں وہاں کا سردار بن گیا۔ تاتاری لوگ ابتدا میں مشرک تھے۔ انہوں نے اسلام کو قبول کیا۔ تاہم وہ ہر ایک مسلمان سے جو اُن کے دائرہ عمل میں رکاوٹ کا موجب ثابت ہو لڑنے کو تیار تھے۔ بغداد سے انہوں نے اپنا رُخ مغرب کی طرف کیا اور انہوں نے سنہ ۱۰۷۰ء عیسوی میں عربوں سے یروشلم چھین لیا۔

۱۰۷۱ء میں لہ انہوں نے منزی کارٹ کی جنگ میں بزنطانی فوجوں کو ایشیا سے نکال دیا، اور ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈالی جو ۱۰۸۱ء سے

لہ AT THE BATTLE OF MANZIKART.

۱۰۹۲ء تک قائم رہی۔

یہ چیز مسیحی زائرین کے لئے ایک ضرب شدید تھی۔ عربوں نے (جنہیں ساماینوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے) انہیں سرزمین فلسطین میں مدعو کیا اور وہ اسباب پر رضامند تھے کہ اُن سے تجارت کریں اور اُن کی خاطر مدارات کریں۔ لیکن ترکوں نے اُن کے قافلوں پر حملے کئے اور ایشیائے کوچک اور فلسطین میں سارے راستوں پر مسافروں کو لوٹتے رہے۔

پہلی صلیبی جنگ ۱۰۹۶ء:-

پچیس ۲۵ سال کے عرصہ تک کل دُنیائے مسیحیت پریشانی میں مبتلا رہی اور رومی پوپوں نے زائرین کی امداد کے لئے بے سود کوشش کی۔ بالآخر ۱۰۹۶ء میں ایک مبشر بنام پیٹر ہرمٹ اُٹھا۔ وہ جگہ جگہ جاتا تھا اور عوام کو آمادہ کرتا تھا کہ بیت المقدس کی طرف جائیں۔ اور مقدس قبر کو جو خداوند کی قبر ہے منکرین کے ہاتھوں سے چھڑائیں۔ اُس نے تمام مغربی یورپ میں جوش و ولولہ کی ایک لہر پیدا کر دی۔ ہر جگہ عوام دستوں میں جمع ہونے لگے۔ ان کے کپڑوں پر اُن کی صلیبیں سِلی ہوئی تھیں اور یوں مرد و زن اور بچے، خاندان کے خاندان اور گاؤں کے گاؤں جمع ہو گئے اور پیٹر ہرمٹ اور والٹر کی قیادت میں یہ ہجوم چل نکلا لیکن ان لوگوں کے پاس نہ تو کوئی ضابطہ تھا اور نہ ہی ان کے پاس خورد و نوش کا سامان تھا۔ اس قافلہ کے بہت سے افراد بھوک اور تکان سے چور ہو کر سرِ سڑک پر دم توڑ گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے کھانے پینے کی چوری کی اور ان ممالک کے لوگوں کے ہاتھ سے قتل کئے گئے جن کی حدود سے وہ گزر رہے تھے اور جن سے اُنہوں نے جھگڑے مول لئے تھے۔ ان میں سے چند افراد قسطنطنیہ

تک پہنچ گئے۔ وہاں کا بادشاہ اُن سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے اُنہیں اپنے جہاز دیئے تاکہ وہ ایشیا کی طرف روانہ ہو جائیں۔ لیکن جونہی انہوں نے وہاں قدم رکھا مسلمانوں نے اُن پر حملہ کر کے اُن سب کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔

چند مہینوں کے بعد ان بے یار و مددگار، غریب الوطن اور جاہل لوگوں کے پیچھے سپاہیوں کی ایک منظم فوج آئی جو ایک فرانسیسی قائد بنام گاڈفرے[۱] بلن کی زیرِ قیادت متحد ہوئی تھی۔ یہ لشکر بھی قسطنطنیہ میں وارد ہوا اور بلن نے جہازوں کے لئے درخواست کی۔ شہنشاہ نے اس لشکر کے سالاروں سے یہ وعدہ حاصل کرنے کی کوشش کی کہ جب وہ یروشلم پر قبضہ حاصل کر لیں تو وہ اس شہر کو شہنشاہ کے ہاتھوں میں دے دیں۔ لیکن لشکر کے سالاروں نے ایسا وعدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خود یروشلم کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں محض زائرین اور مقدس[۲] قبر کا خیال نہ تھا، بلکہ وہ اس شاندار تجارت کے متعلق سوچ رہے تھے جسے وہ فلسطین اور مغرب کے مابین استوار کیا چاہتے تھے۔

بالآخر، اس لشکر کو جہاز مل گئے اور وہ سمندر کو پار کر کے ایشیا میں داخل ہو گئے۔ اس وقت تک ترکوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ چنانچہ عربوں نے ترکوں کو بیت المقدس سے نکال کر خود اس پر قابض ہو گئے۔ عرب رضامند تھے کہ اگر صلیبی مجاہدین اعلانِ جنگ نہ کریں تو وہ واپس اُسی زندگی کو اختیار کر لیں گے جو انہوں نے ترکوں کی آمد سے قبل اختیار کر رکھی تھی۔ صلیبی مجاہدین نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کیونکہ وہ ملک کو فتح کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

۱؎ GODFREYDE BOUILLON ۲؎ HOLY SEPULCHURE.

اُنہوں نے آخر یہی قدم اُٹھایا اور ۱۰۹۹ء میں یروشلم پر قبضہ جمالیا اور وہاں ایک ایسی سلطنت کی بُنیاد رکھی جو اسّی سال تک قائم رہی۔ اُنہوں نے سڑکوں کی حفاظت کی، زائرین کی دیکھ بھال کی، قلعے اور خانقاہیں تعمیر کیں اور مغرب کے ساتھ تجارت کرنے کی حمایت کی۔ اس تجارت کے باعث وینس[1] اپنی امارت میں بام ثُریا پر جا پہنچا۔

اس وقت فلسطین اور مغرب کے مابین آمد و رفت مسلسل طور پر جاری تھی اس لئے سپاہ اور مزید مالی وزر کی مسلسل طور پر ضرورت لاحق تھی۔ آخر کار صلیبی جنگیں زائرین کے اپنے ممالک کے لئے ایک بھاری بوجھ بن کر رہ گئیں، جسے اُٹھانا محال ہو گیا تھا۔

دیگر صلیبی جنگیں:-

کافی عرصہ تک مغربی یورپ کے لوگ مقدس قبر پر قبضہ حاصل کر کے اتنے خوش تھے کہ وہ اس کے تحفظ کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار تھے۔ جونہی وقت گزرتا گیا مشکلات بڑھتی گئیں اور ۱۱۴۷ء میں ایک دوسری صلیبی جنگ کے لئے مجاہدین کو روانہ کیا گیا۔ اس کام کا منصوبہ اتنی بے احتیاطی سے باندھا گیا تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ ناکامیابی ثابت ہوا۔ ۱۱۸۷ء میں عربوں نے صلاح الدین کی قیادت میں یروشلم پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ جمالیا۔ ۱۱۸۹ء میں مغربی ممالک نے اس عظیم نقصان سے قہر آلودہ ہو کر تیسری جنگ کے لئے مجاہدین کو روانہ کیا۔ یہ صلیبی جنگ رچرڈ شیر دل کی ہمت اور جانبازیوں کے باعث مشہور و معروف ہے۔ یہ جنگ بھی ناکامیاب رہی، اور اس کے بعد کی جنگ نے بارسے

---

[1] VENICE.

بھی بدتر نتائج پیدا کر دیئے۔ ۱۲۰۲ء میں ایک اور صلیبی جنگ کے سالار بیتاب ہیں جمع ہوئے اور اسی مقام پر انہوں نے جہاز طلب کئے تاکہ سمندر پار کریں۔ وینس کے لوگوں نے انہیں اس شرط پر جہاز استعمال کرنے کے لئے دیئے تاکہ وہ بھی جنگوں میں اُن کی امداد کریں۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ ۱۲۰۳ء:۔

اس وقت قسطنطنیہ میں ایک معمر بادشاہ (جس کا تخت چھین لیا گیا تھا) اور ایک باغی کے مابین کشمکش جاری تھی۔ وینس کے لوگ اور مجاہدین نے مگر بادشاہ کی امداد کی۔ مذکورہ باغی کو ملک سے نکال دیا۔ اور بادشاہ کو اُس کے تخت پر بحال کر دیا۔ لیکن اس کام کو ختم کرنے سے قبل مجاہدین کی اہل شہر سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے شہر کو اپنے قبضہ میں لیا اور اُسے سپرد آتش کیا (۱۲۰۳ء) انہوں نے گرجوں کو لوٹا گھسوٹا، بے شمار لوگوں کو تہ تیغ کیا، بادشاہ کو نکال دیا اور یروشلم کے متعلق سب کچھ بھول گئے۔ سکندریہ میں یہ لاطینی حکومت سینتالیس سال تک جاری رہی اور پھر یونانی بادشاہ کا ایک جانشین تخت نشین ہوا۔ شہر اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اُس کی اصلی حالت کبھی بھی بحال نہ ہو سکی۔

بچوں کی صلیبی جنگ:۔

اس کے بعد ایک حیران کن واقعہ پیش آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سن رسیدہ لوگ خداوند مسیح اور اُس کی مقدس قبر کو بھول گئے تھے۔ بچوں کی تین گنا بڑی فوجیں جمع ہو گئیں۔ یہ بچے اپنے والدین اور اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر گروہوں کی صورت میں اس مہم پر چل نکلے تھے۔ جونہی انہوں نے قدم اٹھایا

اُن کا لشکر بڑھتا گیا۔ ایک گروہ جرمنی سے، ایک آسٹریا سے اور ایک فرانس سے آیا۔ اُنہوں نے پہاڑوں کی طرف بڑھنا شروع کیا اور پھر سمندر کی طرف چل نکلے۔ اُن کا ایمان تھا کہ خدا اُن کے لئے کوئی نہ کوئی معجزہ کرے گا اور سمندر کے بیچ میں سے راستہ بنائے گا، جیسا کہ اُس نے بنی اسرائیل کے لئے کیا تھا اور یروشلم اُن کے حوالے کرے گا۔ لیکن کوئی معجزہ ظاہر نہ ہوا۔ کثیر التعداد لوگ بھوک اور پیاس سے مر گئے۔ بعض سمندر کے ساحل تک آئے اور ایسے سوداگروں سے ملے جنہوں نے اُن کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اُنہیں جہازوں میں سوار کر کے فلسطین لے جائیں گے۔ لیکن بجائے فلسطین کے وہ اُنہیں مصر لے گئے اور اُنہیں غلاموں کی طرح بیچ ڈالا۔

سینٹ لوئیس شہنشاہ فرانس

(ST LOUIS. KING OF FRANCE 1226-1270)

بعد کی صلیبی جنگوں میں سارے کا سارا مذہبی جذبہ کافور ہو گیا۔ وہ محض ایک ضد اور سیاسی سازشوں کی اُلجھن بن کر رہ گیا جن میں ہار ماننا ناگوار ہو گیا۔ شہنشاہ فرانس، لوئیس نہم (۱۲۲۶ - ۱۲۷۰) نے بغیر کسی ذاتی مفاد کے اس دعوتِ جہاد کو مسیح کی محبت سے مسحور ہو کر قبول کیا۔ وہ ایک خوبرو نوجوان بادشاہ تھا۔ وہ مصر کے راستہ سرزمینِ فلسطین کی طرف چل نکلا لیکن وہاں پہنچ کر اُسے شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا۔ اُسے اجازت دی گئی کہ اپنا فدیہ یا راستگاری ادا کرکے اور آزادی حاصل کر کے واپس فرانس لوٹ جائے۔ اُس نے کئی سالوں تک مستعدی سے اپنی سلطنت کو چلایا لیکن وہ سلطنت کو نہ بھولا۔ ۱۲۷۰ء میں اُس نے اپنے اُمرا کے طبقہ پر واضح کیا کہ وہ مصمم

ارادہ کر چکا ہے کہ ایک دفعہ پھر بیت المقدس کو جائے ۔ اُس نے اُن کو دعوت دی کہ وُہ اُس کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اُس گروہ میں اُس کا دوست جونول (JOINVILLE) بھی تھا جو قبل ازیں اُس کے ساتھ رہا تھا اور اُس نے اُس کی تمام مصیبتوں میں اُس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اُس نے دوبارہ بیت المقدس کی طرف جانے سے انکار کر دیا۔ اُس کے انکار کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وُہ بادشاہ سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے برعکس اُسے بادشاہ سے بیحد محبت تھی۔ لیکن اُس کا ایمان تھا کہ مسیح بیتُ المقدس کی بجائے زیادہ حقیقی طور پر اُس کے اپنے وطن فرانس کی سرزمین میں زیادہ حقیقی طور سے غربا و مساکین کی زندگیوں میں موجود ہے۔ چنانچہ بادشاہ جونول کو اپنے ہمراہ لئے بغیر اپنے ملک سے چل نکلا اور چند ہفتوں کے بعد افریقہ کے ساحل پر پہنچ کر فوت ہوگیا۔ آخری دم تک اُس کے لبوں پر یروشلم کا نام تھا۔ چند سالوں کے بعد یعنی ۱۲۹۱ء میں عربوں نے صلیبی جنگ کی محافظ فوج کو ایکر (ACRE) شہر سے نکال دیا، اور یوں صلیبی جنگوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

صلیبی جنگوں کے نتائج :-

صلیبی جنگوں کے اچھے بُرے نتائج ملے جُلے تھے۔ وُہ جذبۂ عقیدت جس سے مسحُور ہو کر بعض صلیبی مجاہدین نے جنگِ مقدس میں شامل ہونے کی غرض سے ہر چیز کو قربان کر دیا تھا، فنونِ لطیفہ، آرٹ، فنِ تعمیرات، سنگ تراشی و موسیقی میں ظاہر ہُوا۔ عربوں سے ربط و مواصلات رکھنے سے اہلِ یورپ نے بہت کچھ سیکھا۔ اُنہوں نے دوبارہ یونانی علوم و فنون کے چشموں سے اپنی تشنگی بجھائی۔ وُہ یونانی علوم کو بھُول چکے تھے لیکن مسلمانوں نے اُنہیں یہ علوم [illegible]

دستے۔ وہ اسلامی ادویات، ریاضیات اور آرٹ سے متاثر ہوئے لیکن اُن کے نیک مقاصد بد مقاصد میں بدل گئے۔ مثلاً خونریزی، طمع، ذاتی حسد، معاشی ضرورت وغیرہ نے یہودیوں کے خلاف ظلم و تشدد کا بازار گرم کر دیا۔ اور کلیسیا کے زور دینے پر بادشاہوں نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا۔ مشرقی ممالک سے تعلقات پیدا کرنے سے اہلِ مغرب میں کوڑھ کی بیماری پھیل گئی اور کئی صدیوں تک یورپ میں رہی اور ہزاروں انسانوں کو ناقابلِ بیان دُکھوں کا نشانہ بنایا اور مغرب میں مشرقی خیالات پھیل گئے خصوصاً یہ خیال پھیل گیا کہ مادہ لازمی طور پر اپنے اندر بُرائی رکھتا ہے۔ یہ خیال ایک گہرے رنگ میں مسیحیت کے خلاف ہے۔ ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ پوپ کے اقتدار میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ وہ مغرب کے بادشاہوں میں ایک سربرآوردہ حیثیت کا مالک بن چکا تھا جس کی مثال زمانۂ ماضی میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں اور تمام مشرقی ممالک کو بشارت دینے کا کام صدیوں تک التوا میں ڈال دیا گیا۔ ہم اس حقیقت کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بارہویں باب میں پڑھیں گے۔ روجر بیکن (ROGERBACON) نے جو ایک فرانسسکن راہب تھا اور جدید سائنس کا ایک زبردست پیش رو تھا اس خیال کا جائزہ لیا اور اس نے معلوم کیا (بہت کم لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے) کہ صلیبی جنگوں نے اپنے اصلی مقاصد کو باطل ثابت کر دیا کیونکہ صلیبی جنگوں کا مقصد دُنیا کو بنا المسیح کے لیے فتح کرنا تھا۔ روجر بیکن رقمطراز ہے:۔

"نہ ہی اس طریق سے منکرینِ مسیحیت کی زندگیاں تبدیل ہوئیں بلکہ وہ قتل کر دیئے گئے اور جہنم میں پھینکے گئے۔ باقی لوگ جو اس جنگ سے بچ نکلے مسیحی ایمان کے خلاف قہر آلودہ ہو گئے۔ لہٰذا اب دُنیا کے مختلف حصص میں غولوں اور

بُت پرستوں کو تبدیل کرنا ایک مسئلہ لاینحل بن گیا ہے۔"

جو قوم نے صلیبی جنگوں سے صحیح سبق سیکھا تھا۔ اُس نے اپنی قوم کو چھوڑنے سے انکار کیا حالانکہ وُہ قوم چاہتی تھی کہ خالی قبر کی تلاش میں چل نکلے۔

"اَے سنہری یروشلم تجھ میں دودھ اور شہد بہتا ہے۔
تجھ میں محو خیال ہو کہ میرا دل اور میری آواز ڈوب جاتے ہیں۔
مَیں نہیں جانتا کہ میرے لئے وہاں کتنی خوشیاں منتظر ہیں۔
اور وہاں کیسا نورانی جلال اور کیسی انمول خوشی ہے"۔
(برنرڈ آف کلنی۔ بارہویں صدی)

دسواں باب

مغربی کلیسیا کی زندگی

مغربی اقوام نے جو دُنیائے مسیحیت کی مدعی تھی، اہل اسلام سے اس طرح جنگ کیا جس طرح ایک دُنیوی حکومت دُوسری دُنیوی حکومت سے شمشیر زن ہوتی ہے۔ ان کے سپاہی چالاکی، دھوکہ اور غدّاری کے ہتھیاروں کو استعمال کرنے سے شرمندہ نہ ہُوئے۔ وُہ کہتے تھے کہ منکرین پر اعتماد کرنا قرین مصلحت نہیں۔ ہر ایک رُومی پوپ نے یکے بعد دیگرے صلیبی مجاہدوں کو برکت دی اور

اُمراو سلاطین کو آمادہ کیا کہ وُہ ایک نئی صلیبی جنگ کا اہتمام کریں۔ پانچویں صدی میں زوالِ رُوم کے وقت سے کلیسیائے رُوم سلطنتِ رُوم کی قائم مقام بننے میں روز افزوں قدم بڑھاتی گئی۔ مغربی یورپ نے پوپ کا سہارا لینا سیکھ لیا تھا جس طرح کبھی پوپ شہنشاہ کی مدد کا منتظر رہتا تھا۔ لیکن ہمیں اس مغالطہ میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ کلیسیا کو محض سیاست ہی کا ذوق و شوق تھا۔

مغربی اقوام کی زندگی میں مسیحی زندگی ابھی تک اپنے مقامِ اعلیٰ پر ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ متعدد اقوام اپنے آپ کو مسیحی کہتی تھیں اور بعض نے خُداوند مسیح کے اسمِ اعظم سے عظیم الشان کام بھی سرانجام دئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی قوم ایسی نہ تھی جو متواتر مسیحی نظر آتی۔ ایک قوم کبھی بھی کسی کی قیادت کے زیرِ اثر مسیحی تجربہ کی حالت کو پا سکتی ہے۔ لہٰذا ماسوائے ان انمول لمحات کے ہمیں مسیحی زندگی کا مکمل تجربہ انفرادی زندگی میں ڈھونڈنا ہوگا۔ مسیحیت کی سچائی اور قوت کے مظاہرہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی معقول ثبوت نہیں جو ہمیں ماضی اور حال کے مسیحیوں کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

گاتھی طرزِ تعمیر کے گرجے:۔

قرونِ وسطیٰ میں مسیحی تقویٰ کا ایک عظیم المرتبت کام اس زمانے کے گرجوں اور اُسقفی گرجوں میں نظر آتا ہے۔ یہ کام نہ صرف اُس شخص کا تقویٰ ہے جس نے ان گرجوں کی تعمیر کے لئے امداد دی بلکہ اُن فنکاروں اور دست کاروں کا تقویٰ پیش کرتا ہے جنہوں نے اُن کو تعمیر کیا۔ ان میں وُہ اپنے زمانے کی فنی رُوح کا آئینہ ہیں اور اپنے تصور کو کامل آزادی سے دکھاتے ہیں اور اس تصور کو ڈھالنے کے لئے وُہ آزادی اور قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان گرجوں کے

مینار قصبوں اور دیہاتوں سے بلند ہیں اور بعض چوٹیوں پر کلس ہیں جو انسانی خیال کو دنیا کی دوڑ دھوپ سے رہائی دے کر آسمانی مقاموں کی طرف لے جاتے ہیں ہم ان گرجوں میں داخل ہوتے ہیں اور بلندی کی طرف اُٹھتی ہوئی محرابوں کے نیچے کھڑے ہو جاتے ہیں جو چھت اور فرش کی وسیع اور خالی جگہ کو گھیرے ہوئے ہیں یہ فضائے بسیط کو پُر اسرار سایہ اور شوخ روشنی میں منقسم کرتے ہیں جس نے بلند ستونوں کی سادگی، قربانگاہ یا اصطباغ کے حوض اور ستونوں کے بالائی حصوں کی نقاشی اور کانسوں کے عالی شان اسباب آرائش سے ایک نمایاں فرق پیدا ہوتا ہے۔

گرجوں کے اندر روشنی رنگدار کھڑکیوں میں سے داخل ہو کر بھورے یا سلیٹی رنگ کے پتھر پر قوسِ قزح کی طرح منعکس ہوتی ہے۔ یہ تمام سماں ایک گہری متانت کا رنگ پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس منظر کی تفصیلات عام طور پر چنچل اور مضحک نظر آتی ہیں۔ بیرونی دیواروں پر عجیب الخلقت جانور قیام پذیر ہیں۔ ان کے منہ میں نل لگے ہوئے ہیں جن سے بارش کا پانی بہتا ہے۔ گھڑے ہوئے نقش و نگار اور بیل بوٹوں کے مابین عجیب و غریب وضع کے جانور اور آدمیوں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ گرجے کی کھڑکیوں میں کتابِ مقدس کی کہانیوں کی تصویریں ایسے لوگوں کے لئے ہیں جو اَن پڑھ ہیں۔ مقدسین کے مجسمے اُن کے حالات زندگی کی یادگاریں ہیں۔ ان میں اہم ترین مجسمہ مسیح مصلوب کا ہے جو مرکزی محراب کے اُوپر لگایا گیا ہے۔ یہ مجسمہ عابدین کو نجات یا کفارہ کی داستان کی یاد دلاتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے قرونِ وسطیٰ کے گرجوں کو تعمیر کیا ہے کسی صورت سے بھی کامل مقدسین نہیں تھے لیکن اُن کی صناعی نے خدا پاک کا ذکر بنی نوع انسان کے سامنے ضرور کر دیا ہے۔

موسیقی

ان گرجوں میں صوتی اور آلاتی موسیقی کا بہت زیادہ انتظام کیا جاتا تھا۔ اس

کام کا سہرہ پوپ گریگری اوّل کے سر پر ہے۔ وہ ایک مشنری پوپ تھا جس نے مقدس آگستین کو انگلستان کی طرف روانہ کیا تھا۔ زبوروں کے گنگنانے کی طرزِ موسیقی جسے گریگری نے ایجاد کیا تھا تمام مغربی کلیساؤں میں سکھائی گئی تھی اور بعض جگہوں میں ابھی تک اس کا رواج ہے۔ بہت سے گیت جنہیں ہم گاتے ہیں ہم تک قرونِ وسطیٰ سے آئے ہیں۔ مثلاً ذیل کے گیت :۔

"COME HOLY GHOST OUR SOUL INSPIRE"	یہ دسویں صدی کا گیت ہے۔
"JERUSALEM THE GOLDEN" "JESUS CHRIST IS RISEN TODAY"	یہ چودھویں صدی کے گیت ہیں۔

علاوہ ازیں بہت سے اور گیت اتنے ہی قدیم ہیں یا ان سے بھی قدیم ہیں۔

دُعا :۔

ہمارے پاس ابھی تک اُن زمانوں کی دُعائیں بھی موجود ہیں۔ یہ دُعائیں ہمیں خاص طور پر تین پوپ صاحبان سے حاصل ہوئی ہیں۔ لیو اوّل (LEO I) نے جس نے ہُن قوم سے رَوم کو بچایا تھا، بہت سی دُعائیں لکھی ہیں گیلاسیس (GELASIUS) نے، جو لیو کے بعد ہی تھا ان دُعاؤں کا مجموعہ تین جلدوں میں تیار کیا ہے۔ گریگری اوّل نے گیلاسیس کی کتاب کا مطالعہ کیا اور اُسے مختصراً ایک جلد میں پیش کیا۔ یہ مجموعہ اتنا مقبولِ عام اور پسندیدہ ثابت ہوا کہ بعض کلیساؤں نے اپنی اپنی جلدوں کو سونے، چاندی اور ہاتھی دانت سے مجلد کیا۔ ہمارے پاس دیگر قدیم دُعائیں اور مذکورہ بالا دُعائیں موجود ہیں جو ہر ایک

کلیسیا سے جمع کی گئی ہیں۔ ان دُعاؤں کا مطالعہ اور استعمال ہمیں اپنی خلوتی عبادت میں مدد دیتا ہے۔ اور یہ دُعائیں ہمیں یاد دلاتی ہیں۔ کہ ہم اکیلے دُعا نہیں مانگتے بلکہ ہم مقدسین کی رفاقت میں شریک ہیں جو نہ صرف تمام دُنیا کے عالم میں پھیلی ہوئی ہے بلکہ تمام زمانوں میں موجود ہے۔

رہبانیت :-

قرونِ وسطیٰ کی کلیسیاؤں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ بیشمار مرد اور عورتیں رہبانیت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت قدیم زمانوں سے رہبانیت بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ دُوسری اور تیسری صدیوں میں بھی عوام دنیوی زندگی سے منہ موڑتے رہے تاکہ دُعا و دھیان میں اپنا وقت صرف کریں۔ بعض اوقات یہ لوگ اپنے گھروں اور بعض اوقات خانقاہوں میں رہتے تھے۔ سلطنت کے مشرف بہ مسیحیت ہونے کے بعد یہ رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا۔ بعض لوگوں کو ایسا محسوس ہُوا کہ روزمرّہ کی زندگی بہت آسان ہے اور جب حکومت نے شہداء بننے کی فضیلت نہ دی تو انہوں نے خُود بخُود اپنے آپ کو شہدا بنا لیا اور انواع و اقسام کے ذرائع سے اپنی زود و کوب کی۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ عام دُنیا میں ایک مسیحی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ اور راہِ زندگی زیادہ سہولیت سے صحرا یا خانقاہ میں ملتی ہے۔ چنانچہ مردوں کے لئے راہب خانے اور عورتوں کے لئے خانقاہیں کلیسیائی زندگی کا حصہ تصوّر کی جاتی تھیں۔

ان میں سے بہت سے راہب خانوں اور خانقاہوں نے بہت اعلیٰ اعلیٰ کام کئے اور اپنے کمالات دکھائے۔ یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ ان کے بغیر مغرب میں کس طرح بشارت کا کام کیا جا سکتا تھا۔ زوالِ روم اور وحشی اقوام کے حملوں

کے بعد سرزمین مغرب میں بہت تھوڑا علم و ہنر رہ گیا تھا اور جو کچھ بھی رہ گیا تھا اُنہی مقامات میں تھا۔ یہاں ایسے مرد اور عورتیں تھیں جو اپنی زندگیاں مسلسل جنگ و جدل اور دُنیوی ساز باز میں صرف کرنے کی بجائے مطالعہ کتب میں یا غُربا اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں صرف کرنے کی متمنی تھیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے راہب خانوں اور خانقاہوں میں پناہ ڈھونڈی۔ ان راہب خانوں کے ساتھ بہت سے مدرسے اور شفاخانے وابستہ تھے جہاں ہنر مندی اور علم و فضل پُورے عروج پر نمایاں ہُوئے۔

ان راہبوں کی اخلاقی کمزوری کاہلی تھی۔ وُہ ان راہب خانوں میں آکر پناہ لیتے تھے اور بعض اوقات اُنہیں یہ محسُوس ہوتا تھا کہ اُنہوں نے محض دُنیوی آزمائشوں کو ترک کیا ہے لیکن وُہ اُسی طرح کی دیگر آزمائشوں میں آ پھنسے ہیں۔ کئی بار ان راہب خانوں کی اصلاح کی گئی۔ ہم اس بات کا جائزہ لے چکے ہیں کہ چھٹی صدی میں بینیڈکٹ (BENEDICT) نے اصلاح کے کام کو شروع کیا تھا۔ گیارہویں صدی میں ایک اور عظیم الشان تحریک پیدا ہُوئی جو فرانس کے شہر کلُنی[1] کے راہب خانہ میں مرکوز تھی۔ اس تحریک کا نتیجہ التوائے خانہ جنگی تھا جس کے مطابق طبقۂ اُمرا نے باہمی تصفیہ کیا کہ وُہ اپنی خانہ جنگیوں کو ہر ہفتہ سنیچر سے اتوار تک بند رکھیں گے۔

علم و ہنر:۔

مغربی دُنیائے مسیحیت کی مشترکہ زبان لاطینی تھی۔ یہ زبان بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ تمام علمی کتب لاطینی زبان میں قلمبند تھیں۔ سب ممالک کے علماء و فضلاء

---

[1] MONASTRY OF CLUNY IN ERANCE.

ان کتابوں کو پڑھ سکتے تھے اور ان کے متعلق بڑی آسانی سے فرانس، اطالیہ یا انگلستان میں ایک یونیورسٹی سے دوسری یونیورسٹی میں نقل مکان کیا جا سکتا تھا۔ اور وہاں کی زبان کو جس میں تعلیم دی جاتی تھی گہری واقفیت سے سمجھا جاتا تھا ہمارے یورپ میں یونیورسٹیاں بڑھ گئی تھیں اور یہ ترقی زیادہ تر مقتدر پادریوں کی سرگرمی کا نتیجہ تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں عام طور پر بڑے بڑے جلیل القدر علما پائے جاتے تھے۔ ان کی کثیر التعداد کتب میں ابھی تک زندگی بخش دلچسپی پائی جاتی ہے

سائنس :۔

ان ایام میں علم طبیعات کی معلومات بہت محدود اور بے ترتیب حالت میں تھیں اہل یونان نے اس کام کو اچھی طرح شروع کیا تھا لیکن انھوں نے اس کو بھی دیگر یونانی علوم و فنون کے ساتھ بھلا دیا۔ مغرب سے یہ علم غائب ہو گیا تھا تاہم مسلمانوں نے اسے سنبھال کر رکھا تھا۔ مغرب میں عوام جس چیز کو دیکھتے تھے بلا ثبوت مان لیا کرتے تھے۔ ستاروں کے اثر و تاثرات پر نیک شگون اور بد شگونی پر اور متعدد دیگر اوہام پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علم طبیعیات کا مطالعہ جادوگری کے سوا کچھ نہیں ہے۔

غربت :۔

ان ایام میں مغرب میں بے حد غربت اور مصیبت پائی جاتی تھی۔ قرون وسطیٰ کے سب سے اندوہناک نظاروں میں سے ایک چیز ایک کوڑھی کی زندگی تھی۔ اُسے گھر سے نکال دیا جاتا تھا کہ وہ علیحدہ ایک جھونپڑی میں زندگی بسر کرے۔ یہ جھونپڑی گاؤں سے دور ہوتی تھی۔ اس جھونپڑی میں آکر وہ گویا زندہ انسانوں

کے لئے تو مر جاتا تھا لیکن خُدا کے لئے زندہ رہتا تھا۔ یہ ایک کڑا دستور تھا جس سے اس بیماری کو یورپ میں پھیلنے سے روک دیا گیا تھا۔ تیرھویں صدی میں فرانسس آف اسیسی[1] نے غریب اور مصیبت زدہ کوڑھیوں کی خدمت کا کام شروع کیا اور اس خدمت کو سب لوگوں کے لئے جاری رکھا جن کو وُہ کسی بھی طریق سے مدد یا آرام پہنچا سکتا تھا۔ اُس نے راہبوں کے ایک حلقہ کی بنیاد رکھی جو فرائرز (FRIARS) کے نام سے موسُوم ہے۔ ان راہبوں کو نجی مال رکھنا ممنوع تھا۔ اُنہیں ہر کہیں جانے کا حکم تھا تاکہ وُہ ہر شخص کو مدد دے سکیں یا امداد کی ایک صورت بُت پرستوں کو بشارت دینا تھا۔ ہم بعد ازاں فرانسسکن مشن[2] کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں گے۔ ڈومینک[3] نے جو ایک ہسپانوی تھا، اسی طرح کے حلقہ کی بنیاد رکھی تھی تاکہ وُہ جہلا کو زیورِ علم سے مزیّن کرے۔

غُلامی:-

قرونِ وسطیٰ میں بہت سے مغربی ممالک سے غلامی غائب ہو گئی تھی۔ ربنا المسیح نے چند مخصوص الفاظ میں یہ نہیں فرمایا تھا کہ غلاموں کو رکھنا ایک غلط فعل ہے لیکن عوام نے اس چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا کہ اُن لوگوں کو غلام بنانا جن کے لئے خُداوند نے اپنی جان دی ہے ایک غلط فعل ہے۔ جب رؤسا و امرا بسترِ مرگ پر لیٹ جاتے تھے تو تقدیس شدہ خادم الدین اس بات پر زور دیتے تھے کہ وُہ اپنے غلاموں کو آزاد کریں۔

"اے خُداوند مُجھے اپنے اطمینان کا وسیلہ بنا۔"

---

1 St. FRANCIS OF ASSISI 2 FRANCISCAN MISSIONS.
3 DOMINIC.

جہاں کہیں عداوت پائی جاتی ہے وہاں مجھے محبت کا بیج بونے دے
جہاں کہیں رنج والم ہے وہاں مجھے خوشی کا بیج بونے دے۔
اے میرے آسمانی آقا۔
بخش دے کہ میں زیادہ تر تسلی حاصل کرنے میں مصروف نہ رہوں بلکہ دوسروں کو تسلی دوں۔ میں اپنے آپ کو دوسروں پر ظاہر کرنے کی بجائے دوسروں کو سمجھوں۔ میں دوسروں کا محبوب بننے کی بجائے دوسروں سے محبت کروں"۔
(فرانسس آف اسیسی۔ تیرھویں صدی)

"موجودات کے متعلق غلطی رکھنے کا مفہوم خدا کے متعلق باطل رائے دینا ہے جس سے عوام الناس کے خیالات خدا سے دور ہو جاتے ہیں"۔
(تھامس اکیوناس۔ تیرھویں صدی)

گیارھواں باب

مغربی کلیسیا کی زندگی!

روم۔

ہمیں مغربی رومی کلیسیا کی ایک خاص حالت پر نظر ڈالنا چاہیئے۔ یہ ایک مسلّم امر تھا کہ روم حکومت کا صدر شہر تھا حتٰے کہ ۳۳۰ء میں قسطنطین نے

بوسفرس کے کنارے ایک نیا شہر تعمیر کیا۔ اس کے بعد قسطنطنیہ دارالحکومت اور علم و ہنر کا مرکز بنا اور رُوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا اور کہنا شروع کیا کہ رُوم ایک متروک ویرانی ہے۔ یہ جذبہ اس وقت بہت بڑھ گیا جب رُوم وحشی اقوام کے حملوں کی تاب نہ لاکر مغلوب ہوا اور دوبارہ رُومی لوگوں نے یونانی زبان میں گفتگو کرنا بند کر دیا اور لاطینی زبان کی طرف واپس رجُوع کیا۔ لیکن وحشی اقوام اور اُن کی اولاد نے کبھی بھی اس میں حصّہ نہ لیا۔ جب وہ آہستہ آہستہ مہذّب بنتے گئے۔ ہسپانیہ، فرانس، انگلینڈ، جرمنی اور اسکینڈی ممالک (یعنی ناروے۔ سویڈن۔ ڈنمارک) کے باشندوں نے کچھ دیر کے بعد رُوم کے ساتھ بحیثیت مفتوح یا فاتح، غلام یا سپاہی گہرا تعلق پیدا کیا۔ رُومی افواج رُومی قانون، رُومی حکام، رُومی دولت اور رُومی تزک و احتشام نے پُشت در پُشت اُن کی زندگیوں پر اثر کیا۔ بالآخر رُومی مشنری اُنہیں تعلیم دینے کے لئے آئے، اور جب اُنہوں نے مسیحیت کو قبُول کیا تو اُنہوں نے عام طور پر جوشِ محبت سے مسحُور ہو کر کلیسیائے رُوم کی طرف نگاہیں اُٹھائیں کیونکہ وہ اُن کی "ماں" کلیسیا تھی۔

رُومی مشنیں :-

مشنری صاحبان اپنے ہمراہ نہ صرف انجیل لائے بلکہ مہذّب زندگی کی خوشگوار اور صحت بخش چیزیں بھی لائے۔ جبتک مشنری کام سلطنت کی حدود سے باہر نہ نکلا مسیحیوں کو دیگر لوگوں سے زیادہ کوئی علم نہ تھا۔ اور ان کے پاس سوائے انجیل کے کوئی دُوسری شے نہ تھی جو وہ لوگوں کو پیش کرتے لیکن جب وحشی لوگوں میں خدمت کا کام پھیلا تو بیماروں کی دیکھ بھال اور مدرسے خدمت کا ضروری حصّہ

بن گئے۔ بیمار، غربا، مصیبت زدہ اور مفلس لوگ ہر قسم کی امداد کے لئے خانقاہوں میں آنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کلیسیا کی یہ ایک ضرورت تھی کہ لوگوں کو بیابان میں کھانا کھلائے جس طرح ایک دفعہ ربنا المسیح نے انہیں روٹیوں اور مچھلیوں سے سیر کیا تھا۔ نیز اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عوام کو اس گوشت سے دیا جائے جس میں ہمیشہ کی زندگی ہے۔ (یوحنا ۶: ۲۶-۲۷)

پاپائے رُوم اور شہنشاہ

ان جدید ممالک میں جونہی وہ بڑھے، ہر ایک شخص نے بغیر حیل و حجت اس امر کو تسلیم کر لیا کہ شہنشاہ کو دنیوی قوت اور پاپائے رُوم کی رُوحانی قوت میں ایک گہرا تعلق ہے جب پاپائے رُوم نے شارلی مین کے سر پر تاج رکھکر اُسے شہنشاہ بنایا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دونوں بلکہ تمام مغربی دُنیا پر بلکہ تمام قدیم رُومی سلطنت پر ایک بحیثیت رُوحانی صدر اور دُوسرا بحیثیت دنیوی صدر حکومت کریگے۔ لیکن اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اس نئی حکومت کے سردار کبھی بھی زیادہ دیر تک متفق الرائے نہ ہو سکے اور اس حکومت کی ساری تاریخ شہنشاہِ رُوم اور پاپائے رُوم کے جھگڑوں سے بھری پڑی ہے۔ نویں اور دسویں صدیوں میں پوپ صاحبان کا اقتدار بہت کم ہوگیا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پاپائے رُوم کا انتخاب کلیسیا کے پادری صاحبان اور عوام کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اُمرا، جن کے پاس روپیہ اور رسُوخ تھا، اس کام کو سرانجام دیتے تھے۔ عام طور پر وُہ ایسا بالکل نااہل لوگوں کو اس کام کے لئے انتخاب کرتے تھے جو اُن کے منظور نظر ہوتے اور اُن کے احکام کو بے چُون و چرا تعیل کرتے۔ یہاں تک کہ نوجوان لڑکوں کو بھی اس عہدے پر تعیین کیا جاتا تھا۔

گیارھویں صدی میں یہ شرمناک کام اس حد تک بڑھ گیا کہ شہنشاہ نے اِسکی مخالفت کی (۱۰۴۶ء) اور اپنی مرضی سے چار پوپوں کو یکے بعد دیگرے تخت نشین کیا یہ سب کے سب جرمن تھے اور نیک سیرت تھے۔

گریگری ہفتم (۱۰۷۳ء تا ۱۰۸۵ء)

ان واقعات کے کچھ عرصہ کے بعد یعنی ۱۰۵۹ء میں کلیسیائے رُوم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے بشپ صاحبان کلیسیا ہی کی طرف سے مقرر کئے جانے چاہئیں۔ اُس دن سے بشپوں کا تعین کارڈینل (CARDINAL) کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ کارڈینل صاحبان بشپوں کا ایک اندرونی حلقہ ہے جن کے ساتھ چند ممتاز الحیثیت پادری صاحبان ہوتے ہیں اور وہ زیادہ تر رُوم میں مقیم ہوتے ہیں۔ آخر گریگری ہفتم پوپ بنا (۱۰۷۳ء-۱۰۸۵ء) وہ ایک بااثر آدمی تھا اور اُس نے یہ کوشش کی کہ پاپائے رُوم کی عظمت و اقتدار سب سے بڑھ چڑھ کر نظر آئے۔ ۱۰۷۷ء میں ایک موقع پر اُس نے ہنری چہارم کو جو شہنشاہ وقت تھا مجبور کیا کہ وہ اُس محل میں آئے جہاں وہ مقیم تھا اور تین روز تک صحن میں جہاں برف باری ہو رہی تھی معافی مانگنے کے لئے انتظار کرے۔ شہنشاہ کو اس وقت پوپ کی امداد کی اتنی ضرورت تھی کہ اُس نے اس قسم کے سلوک کی برداشت کی۔ دو سال کے بعد اُسی شہنشاہ نے رُوم پر قبضہ کیا اور گریگری کے محل کا محاصرہ کیا۔ گریگری نے اپنی امداد کے لیے غیر ملکی سپاہیوں کو آنے کے لئے کہا اور بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگا۔ اُنہوں نے شہر کو جلا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ پوپ کو وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ وہ جلاوطنی میں مر گیا۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود وہ کام جو اُس نے کیا تھا دُنیا میں قائم رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ

کے بعد شہنشاہ بھی فوت ہوگیا۔ گرگیری کے جانشینوں نے شہنشاہ کے جانشینوں کو اطاعت و فرمانبرداری پر مجبور کیا اور یوں پاپائے رُوم کو تقریباً پانچ صد سال تک یعنی زمانہ اصلاح تک بادشاہوں سے اعلیٰ وارفع تسلیم کیا گیا۔

گرگیری کے کارہائے نمایاں میں سے ایک چیز یہ تھی کہ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ پادری صاحبان غیر شادی شدہ حالت میں زندگی بسر کریں اور اس معاملہ میں سخت مخالفت کے باوجود وہ کامیاب رہا۔ اُس دن سے کلیسیائے رُوم کے پادری صاحبان مجرّد حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

اناجیل میں خُدا کی بادشاہت کا تصوّر

اناجیل میں ہم مطالعہ کرتے ہیں کہ ہمارے خُداوند یسُوع مسیح کو ایک اچھی حکومت کے وسیلے خُدا کی بادشاہت قائم کا تصوّر ایک آزمائش نظر آئی۔ وہ اپنے آپ کو ایک سیاسی قائد بنا سکتا تھا۔ شاید وہ ایک بادشاہ بن سکتا تھا۔ کیونکہ اُسے اپنی ذاتی قوت اور الٰہی ذمہ داری کا احساس تھا۔ سو بعض لوگوں نے قدیم اور جدید زمانوں میں اپنے آپ کو اس کام کے کرنے کا اہل سمجھا تھا۔ اگرچہ اُنہوں نے خُدا کی بادشاہت کو قائم نہیں کیا تاہم اُنہوں نے انسانوں کی پائیدار حکومتوں کی بنیادیں رکھی ہیں۔ وہ بادشاہت جس کا خُداوند مسیح متمنی تھا کسی خارجی قوت کے بل بوتے پر قائم نہیں ہونی تھی بلکہ اُسے خُدا کی بادشاہت کے ہر شہری کو اپنی مرضی و رضا سے قبول کرنا تھا۔ اُس کی حکومت کا اصول مرقس ۱۰: ۴۲-۴۵ میں مرقوم ہے۔ اس بادشاہت کا بادشاہ بننے کے لئے وہ ایک سیاسی قائد نہیں بلکہ ایک اُستاد بنا۔ ایک سے زائد دفعہ اُس نے سیاسی اختیار حاصل کرنے سے انکار کر دیا (ملاحظہ ہو یُوحنا ۶: ۱۵؛ ۱۸: ۳۶؛ لوقا ۱۲: ۱۴)

خداوند نے اپنی زبانِ معجز بیان سے ارشاد فرمایا کہ آپ کی بادشاہت خمیر کی طرح ہے جو ہماری نظروں کے سامنے، گندھے ہوئے آٹے میں غائب ہو جاتا ہے اور اُس کو تبدیل کرتا ہے (متی ۱۳: ۳۳) یہ اصُول درست ثابت ہُوا ہے۔ اُستاد کا طریقِ تعلیم بتدریج عمل میں آتا ہے اور اس صورت میں یہ طریق ضرورت سے زیادہ آہستہ تھا کیونکہ حکام کلیسیا نے خداوند مسیح کے نام پر کلام کرتے ہوئے اُس کے طریقِ کار کو ترک کر دیا اور ایسے ایسے کام کئے جن کے کرنے سے اُس نے انکار کیا تھا اور یوں انہوں نے مشرکین کے ہتھکنڈوں کو اختیار کر لیا۔

پاپائے رُوم نے دُنیا کی اس فوری ضرورت کو محسوس کیا کہ اچھے اچھے بادشاہ حکومت کریں اور انہوں نے خود ہی اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور عام طور پر اس فرض کو اچھی طرح سرانجام دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وُہ ایسی حالتِ زار میں پڑ گئے کہ انہوں نے دنیوی بدکرداری کے ساتھ اٹے سٹے کرنے شروع کر دئے۔ اور یوں پوپیت ایک دنیوی حکومت بن گئی اور اس کی اپنی فوجیں اور سیاست، دُنیوی فرمانروائی اور سلطنت کے لئے اُس کے بڑھتے ہُوئے دعاوی پیدا ہو گئے۔ ان حالات میں پوپ صاحبان دیگر سلطنتوں کے ساتھ انہی کے طریقوں سے حیلہ وتدبیر، سودا بازی اور ساز باز کرنے سے شرمندہ نہ ہُوئے۔ پاپائے رُوم نے کلیسیا کو اسی طرح تعمیر کیا جس طرح قسطنطین نے اس کو شروع کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلیسیا بحیثیت ایک منظم جماعت کے بار بار مجموعی شہادت دیتی ہُوئی بگڑی گئی۔ اس کی شہادت خدا اور بعل کی یک وقت خدمت کرنے کی سعی سے گڈمڈ ہو گئی (لوقا ۱۶: ۱۳) اب یہ عمارت بربادی کے قریب پہنچ چکی ہے۔ موجودہ ایام میں یہ حقیقت صاف

صاف نظر آتی ہے۔

صُوفیانہ طبقہ (MYSTICS)

لیکن سیاسی زندگی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ چودھویں صدی میں ایک صُوفیانہ خیال کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا جس سے روحانی تجربات کا ایک بیش قیمت نتیجہ حاصل ہُوا۔ وجدانِ رُوح اُس تلاش و جستجو کو کہتے ہیں جس سے وصالِ الٰہی فوری حاصل ہو۔ یہ جذبہ ہر مذہب کے مرکز میں پایا جاتا ہے اور ہم ہر وقت اس کا تذکرہ سنتے ہیں۔ یہ چیز مذہب کی عظیم الشان منازل میں سے ایک ہے۔ طامس اے کیمپس چودھویں صدی کے بہترین صوفیوں میں سے ایک تھے۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سے ہیں۔ بعض دُنیا سے علیحدہ ہو کر تنہائی میں زندگی بسر کرتے تھے لیکن دُوسرے لوگ روزمرہ کی سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے اور بہت سی انفرادی اور مجلسی خدمات میں مصرُوف رہتے تھے۔

وائیکلف (WYCLIFFE)

اس صدی کے اختتام پر کلیسیائی حلقہ کے ایک فرنگی پادری نے کتاب مُقدس کو لاطینی ولگیٹ سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ شومئے قسمت سے حکامِ کلیسیا نے یہ خیال کیا کہ جُہلا کے لئے یہ قدم خطرناک ہے اور روزمرہ کی عوامی زبان متبرک پیغامِ نجات کو ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ یہ بات درست ہے کہ تلاوت خطرناک ہوسکتی ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ عوام کو تلاوت سے روکا جائے بلکہ یہ کہ ان کو تلاوت کرنا سکھایا جائے۔ لہٰذا وائیکلف کو اپنے لوگوں

ف[1] MYSTICAL THOUGHTS.
ف[2] THOMAS A. KEMPIS.

سے کوئی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اُس کی تعلیم کو جان ہس[1] نے جو بوہیمیا کا باشندہ تھا جاری رکھا (بوہیمیا اب زیکوسلوویکیا[2] کا ایک حصہ ہے) ہس نے وائکلف کی طرح تعلیم دی اور عوام الناس کو کتاب مُقدس سے روشناس کروایا۔ اور پوپ کے مکمل اختیار و اقتدار کا انکار کیا۔ اس فعل کے لئے اس پر نالش کی گئی اور اُس پر سزائے موت کا فتویٰ دیا گیا اور اُسے جلا دیا گیا۔ اُس کی موت کے بعد اُس کے شاگرد ایک گروہ کی صُورت میں رہے اور اُن کی اولاد نے اب موریوین (MORAVIAN) کلیسیا کو وجُود دیا ہے۔ یہ تحریک قدیم کلیسیا سے منقطع ہونے کا ایک خطرناک قدم تھا۔

"اُس نے یہ نہیں کہا تھا۔ تُم آزمائش میں نہیں ڈالے جاؤ گے، تُم تھک نہیں جاؤ گے، تُم ستائے نہیں جاؤ گے بلکہ اُس نے کہا تھا۔ تُم مغلوب نہیں ہو گے۔"
(جُولین آف ناروچ - چودھویں صدی)

بارہواں باب

تنویر الانوار
(تجدیدِ علم و ہنر)

ہم نے نویں باب میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ صلیبی جنگوں کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ یونانی علم و ہُنر سرزمینِ مغرب کی طرف واپس لوٹ گیا۔

---

[1] JOHN HUS. [2] CZECHO-SLOVAKIA.

پندرھویں صدی میں یونانی علم سرعت سے پھیلا اور اس کا ہر جگہ پُرجوش طریق سے استقبال کیا گیا۔ یہ تحریک چودھویں صدی ہی سے شروع ہوگئی تھی جیسا کہ ہمیں تازن کے ایک طالب علم کی ڈائری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ طالب علم اطالیہ کے ایک شہر فلورنس میں مقیم تھا۔ یہاں ایک یونانی عالم وارد ہوا۔ اس کا نام کرائی زولوراس (CHRYSOLORAS) تھا۔ وہ ۱۳۹۶ء سے ۱۴۰۰ء تک فلورنس میں رہا۔ مذکورہ بالا طالب علم اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہوا رقمطراز ہے۔

"کیا تم اپنی بہترین دلچسپی کو بھول تو نہیں جاؤ گے۔ اب تم ہومر، پلیٹو اور ڈیموستھینز اور دیگر بڑے بڑے شعرا، فلسفیوں اور فصیح و بلیغ مقررین کی تفہیم کے موقع کو کھو دوگے جن کے متعلق وہ عجیب و غریب حقائق کو بیان کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی ان سے بات چیت کرنا اور ان کے جامِ حکمت کو نوش کرنا چاہیے۔ کیا تم اس سنہری موقع کو کھو دوگے؟ سات سو سال تک اطالیہ میں کسی ذی روح نے یونانی ادبیات کو نہیں جانا لیکن اس کے باوجود ہم اس خیال پر متفق الرائے ہیں کہ زبان کا کما حقہ عبور اہل یونان ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ تمہارے لئے یہ کیسی بھلائی و مفید بات ہوگی کہ تم اس زبان پر قدرت حاصل کرو۔ یہ زبان تمہارے علم کو وسعت دے گی اور تمہاری مسرت میں بھی اضافہ کرے گی۔ رومی قانون کے اساتذہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور تم کبھی بھی اس کے مطالعہ سے محروم نہیں ہو سکتے لیکن یونانی زبان کا ایک ہی استاد ہے اور اگر تم اُسے کھو دوگے تو تمہارے پاس کوئی اور شخص نہیں رہے گا جس سے تم یہ زبان سیکھ سکو گے۔"

یہ تحریک جس نے گہرے طور سے علوم و فنون پر اثر کیا (RENAISSANCE) یہ انوارالادب کہلاتی ہے کیونکہ یہ تحریک انسانی ذہن کی ایک نئی پیدائش تھی ۱۴۵۳ء میں اس دور میں ایک امتیازی واقعہ پیش آیا یعنی قسطنطنیہ عثمانی ترکوں کے قبضہ

میں آگیا۔

زوالِ قسطنطنیہ ۱۴۵۳ء

پندرہویں صدی کے شروع میں مشرقی سلطنت، جس کو بزنطینی سلطنت کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے اپنے زوال کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ۱۰۹۲ء میں سلجوکی سلطنت کے بعد (ملاحظہ ہو باب ۹) مغربی ایشیا پر شمالی قبائلی منگول اور عثمانی ترکوں نے دو اور حملے کئے۔ (ملاحظہ ہو باب تیرہ) پندرہویں صدی کے شروع میں عثمانی ترک قسطنطنیہ پر بے حد دباؤ ڈال رہے تھے۔ وہ باسفرس کے آر پار کئی سفر کر چکے تھے اور انہوں نے شہر کے کثیر حصہ کو فتح کر لیا تھا اور اس کا یہ نتیجہ پیدا ہوا تھا کہ یہ شہر سمندر کے سوا مغرب کے دیگر حصص سے منقطع ہو چکا تھا۔ اسقفِ اعظم کی امداد سے شہنشاہ پوری جد وجہد کر رہا تھا کہ مغرب سے امداد حاصل کرے لیکن مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے مابین فرقہ بندی کی وجہ سے یہ کام دشوار ہو گیا تھا (ملاحظہ ہو باب ہفتم) ۱۴۳۹ء میں اطالیہ بمقام فریرہ (FERARA) ایک کونسل منعقد ہوئی اور شہنشاہ نے اسقفِ اعظم کے ہمراہ اس میں شرکت کی تاکہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ کیا کلیسیا کے ان دونوں حصص میں ملاپ پیدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ وہ پوپ کے تمام مطالبات کو پورا کرنے کے لئے رضامند ہو گئے اور انہوں نے ہر ایک بات کو جس سے اختلاف رائے پیدا ہوئی تھی چھوڑ دیا تاکہ انہیں فوجی امداد حاصل ہو۔ پوپ نے امداد کا وعدہ کیا لیکن جب یہ معاہدہ قسطنطنیہ میں لایا گیا اور اسے با آوازِ بلند مقدس صوفیا کے گرجے میں پڑھا گیا تو اہلِ یونان اس سے غضبناک ہو گئے۔ انہوں نے اسے جھپٹ

کر چھین لیا اور پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس موضوع پر مزید گفت و شنید سے انکار کر دیا۔

۱۴۵۳ء میں اس کا نتیجہ حاصل ہو گیا۔ عثمانی افواج نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا اور اہلِ شہر کے جان پر کھیل کر بچانے کی کوشش کے باوجود شہر حملہ آوروں کے ہاتھ میں آگیا۔ شہنشاہ شہرپناہ کی آخری لاحاصل حفاظت کرتا ہوا اپنے گھرے لواحقین اور دوستوں کے ہمراہ مارا گیا اور غنیم کے پاؤں کے نیچے روندا گیا۔ بہت سے لوگ قتل کر دیئے گئے اور کثیر التعداد لوگ بحیثیت غلام فروخت کئے گئے۔ بہت سے صناعی کے نمونے توڑ پھوڑ دئیے گئے اور بیش قیمت کتب نذرِ آتش ہوئیں اور ردی کے داموں فروخت کی گئیں۔ مقدس صوفیا اور دیگر گرجوں کو مساجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان مسیحیوں کو جو موت سے بچ نکلے صرف ایک گرجا رکھنے کی اجازت دی گئی تاکہ وہ اسمیں اپنی عبادت کر سکیں اور بڑی اسقفِ اعظم کا کام ابھی تک وہاں جاری ہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ ابھی تک یونانی راسخ العقیدہ کلیسیا کا مرکز ہے۔

مشرقی کلیسیا (THE EASTERN CHURCH)

گیارہ سو سال تک قسطنطنیہ کا شہر خداوند یسوع مسیح کا گواہ رہا اور یہ شہر یورپ اور ایشیا کی حدِ فاصل پر دنیائے مسیحیت کا قلعہ تھا۔ لیکن اس کی گواہی خلط ملط ہو چکی تھی اور عام طور پر باطل تھی۔ تاہم وہاں ہمارے خداوند کی عقیدت کے لئے گہری گرم جوشی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ وہاں کی عبادتوں کی طرزیں، عمارات، رسوم اور موسیقی سامعین و ناظرین کے لئے جنت کے نظارے پیش کرتی تھیں۔ یہی چیز تھی جس نے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے رومی کلیسیا کو

مغربی کلیسیا بننے کی بجائے مشرقی کلیسیا بنا دیا۔ چند دُعائیں اور گیت جو آجکل ہمارے ہاں مروّج ہیں قسطنطنیہ ہی سے آئے ہیں۔ ہم اُسقفِ اعظم کرائی زوستم (CHRYSOSTOM) کا اِسم مبارک بھُول نہیں سکتے لیکن وہاں کی کلیسیا نفسانی ہو چکی تھی اور اپنے آپ کو ہر معاملہ میں بادشاہوں کی محکوم کرتی رہی تھی۔ پارٹی بازی کی وجہ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب روزِ عدالت آیا یہ پائمال ہو گئی اور اپنے زوال سے ہمیں یہ سبق سکھایا جو ہم سب کو یاد رکھنا چاہیئے کہ خُداوند مسیح کی خدمت مُردہ دلی سے نہیں کی جا سکتی ورنہ ہمیں صفِ اوّل چھوڑ کر کسی اور مقام پہ کھڑا ہونا ہوگا۔

زوالِ قسطنطنیہ کے بعد

سلطنت اپنے مقامِ اعلیٰ سے گری اور چکنا چُور ہو گئی لیکن وُہ بالکل فنا نہ ہُوئی۔ مغرور لوگوں میں علماء حکما بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح برباد شدہ کتب خانوں سے کتابیں بچا کر لے گئے تھے۔ اُنہوں نے یورپ کی یُونیورسٹیوں اور مدرسوں میں جہاں کہیں بھی وُہ اپنا اپنا سر چھُپا سکے پناہ لی۔ اور یُونانی زبان کی تعلیم، قدیم اہلِ یُونان اور کلیسیا کے قدیم مقدسین کی حکمت کی تعلیم دے کر اپنا اپنا پیٹ پالا۔ چنانچہ شہر کی شکست اور بدحالی سے تجدیدِ علم و ہُنر کی ابتدا ہُوئی۔

چھپائی کی ایجاد ۱۴۵۰ء

انہیں ایّام میں تقریباً ۱۴۵۰ء میں چھپائی کے کام کو ایجاد کیا گیا۔ اس ایجاد نے بمقابلہ کی موجودہ یا قدیم زمانوں کی کسی دُوسری ایجاد کے۔ نسلِ انسانی میں بہت زیادہ فرق پیدا کیا۔ جبتک کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور ایک

وقت میں ایک کاپی نقل کی جاتی تھی تو ان کتابوں کو صرف اُمراء و رؤسا ہی استعمال کر سکتے تھے۔ بڑا بھاری خطرہ تھا کہ یہ کتابیں برباد یا گم نہ ہو جائیں جیسے کہ بہت سی کتابیں نابود ہو چکی تھیں۔ لیکن جب ان کتابوں کو چھاپا جاتا ہے تو وہ محفوظ حالت میں رہتی ہیں اور اتنی زیادہ سستی ہو سکتی ہیں کہ انہیں ہر ایک آدمی خرید سکتا ہے۔ اس ایجاد کو ایک سے زائد آدمیوں نے درجہ تکمیل تک پہنچایا اور اس کے وسیلے جدید علوم و فنون جو ایک دوسری صدی کے عرصہ میں یورپ میں داخل ہوتے رہے سب اطراف میں پھیلتے رہے۔

ترکی قوت

ترکوں کی قوت یورپ کے مشرقی حصہ میں پھیلتی گئی حتےٰ کہ دو سو تیس ۲۳۰ کے بعد ترک ویانا (VIENNA) پر جو آسٹریا کا دارالحکومت تھا قبضہ حاصل کرنے میں ناکامیاب نکلے۔ اس صدی کے اختتام پر یعنی ۱۴۹۲ء میں ہسپانیہ کے آخری شہر گرانیڈا (GRANADA) پر مسیحیوں نے قبضہ حاصل کیا۔ چنانچہ جو کچھ بحیرہ رُوم کے مشرقی کنارے پر حاصل کیا گیا تھا مغربی کنارے پر کھو دیا گیا تھا۔ اسلام اور دُنیائے مسیحیت ایک طویل جنگ میں مصروف ہو گئے۔

جدید طبقات کی معلومات

علوم و فنون کے علاوہ دیگر جدید طبقات بھی نظر آنے لگے۔ ۱۴۹۲ء میں جس سال گرانیڈا پر قبضہ کیا گیا اُسی سال کرسٹوفر کولمبس (CHRISTOFHER COLUMBUS) نے امریکہ دریافت کیا۔ اُس نے مغرب کی سمت میں بحری سفر کیا۔ اس کی توقع تھی کہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر پہنچے۔ جب وہ خشکی کے قریب پہنچا تو اُسے

معلوم ہوا کہ یہ مقام ہندوستان نہیں بلکہ ایک نئی براعظم تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کہ دنیا ہر ایک شخص کے قیاس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بے شمار جان بازوں نے تحقیق و تفتیش اور حصولِ دولت کے لئے کولمبس کی تقلید کی۔ چھ سال کے بعد ۱۴۹۸ء میں پرتگالی امیر البحر واسکوڈی گاما نے مخالف سمت میں سفر کیا اور افریقہ کے گرد چکر لگا کر کالی کٹ کے مقام پر پہنچا۔ یہ جگہ سرزمین ہند کے مغرب میں واقع ہے۔ چنانچہ آخر کار ہندوستان اور مغرب کے مابین مستقل تعلقات پیدا ہو گئے۔ اس وقت تک سیاحوں کی آمد شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی۔ انہیں ایک مشکل خشکی کا راستہ درپیش تھا جو بے شمار ممالک میں سے گزرتا تھا۔ ہندوستان اور مغرب ایک دوسرے سے جدا تھے۔ ایک ملک دوسرے کے متعلق یہی سنتا تھا کہ وہ بالکل الگ تھلگ ہے۔ اب یہ دشواری دور ہو چکی تھی۔

"خداوند خدا، ازلی اور قادر مطلق، تو نے اپنے کلامِ مقدس کے وسیلے آسمان و زمین اور سمندر کو تخلیق کیا ہے۔ تیرا اسمِ اعظم مبارک ہو اور جلال پائے۔ تیری شانِ کبریائی کی تمجید ہو جس نے یہ منظور فرمایا کہ تیرے عاجز بندے کے وسیلے تیرا مقدس نام معلوم کیا جائے۔ اور دنیا کے عالم کے اس حصہ میں اس کی منادی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(یہ دعا کولمبس کے لبوں سے نکلی تھی جب اُس نے سین سالوادڑ کے ساحل پر ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو قدم رکھا تھا)

تیرھواں باب

ممالکِ مشرق کی کلیسیائیں

طلوعِ اسلام کے وقت سے ممالکِ مشرق کی کلیسیائیں اہلِ مغرب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ وہ پورے طور سے بھلا دی گئی تھیں۔ افسس کی کونسل کے بعد اِن کلیسیاؤں نے مغلوب الغضب ہو کر اُن کلیسیاؤں کے دستورات و خیالات سے منہ موڑ لیا تھا جن کلیسیاؤں نے ان سے بے انصافی کی تھی اور اخلاص و شفقت کی نفی کا ثبوت دیا تھا۔ اُنہوں نے نسطوری تعلیم کو تھامے رکھا تھا جس کے خلاف کونسل آف چالسیڈن نے فتوےٰ دیا تھا۔ اُن کلیسیاؤں نے یہ قدم اس وجہ سے نہیں اٹھایا تھا کہ وہ اس تعلیم کی صحت پر ایمان رکھتی تھیں بلکہ اس غرض سے کہ وہ قطعی ارادہ کر چکی تھیں کہ وہ ان کونسلوں کے فیصلوں کو قبول نہیں کریں گی جو قسطنطنیہ میں منعقد ہوتی تھیں۔ اُن کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ جب وہ سلطنتِ روم کے دیگر مسیحیوں کے ساتھ زیادہ گہرے تعلقات نہیں رکھتے تھے تو اُن کے ایرانی حکمران اُن کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

نسطورین اور مونوفیزائٹس

بدقسمتی سے مشرقی کلیسیائیں منقسم حالت میں تھیں۔ ان میں نہ صرف نسطوری

کلیسیائیں ہی تھیں (جو ڈائیوفیسائٹ DYOPHYSITES بھی کہلاتی تھیں)
وُہ اس عقیدہ کی پابند تھیں جو انطاکیہ سے آیا تھا بلکہ مونوفیزائٹس بھی تھیں جو
اس عقیدہ کی پابند تھیں جو مصر سے آیا تھا۔ باہمی بحث و مباحثہ کی گرد واہٹ
میں یہ دونوں پارٹیاں اس بات کو بھول گئی تھیں کہ وُہ کس ذاتِ اقدس کا
تذکرہ کر رہی ہیں۔ وُہ اس بات سے شرمندہ نہ ہوئیں کہ وُہ کس قدر جلالی اور
مُتبرک مضامین کو اپنے غیض و غضب کی بحث و تکرار میں گھسیٹ رہی ہیں۔
اسی چیز میں اُن کی کمزوری پائی جاتی ہے۔ ان کی قوت ان کے بشارتی جوش میں
مضمر تھی۔ پانچویں صدی میں یہ کلیسیائیں تقریباً مر چکی تھیں جب بارڈس اڈیسہ
کے بشپ نے دوبارہ اُن کی تنظیم کی اور اُنہیں مضبُوط کیا۔ اُس نے مصر اور
سیریا کے علاقوں کا سفر کیا اور پریسٹڈل کا تقرر کیا اور کلیسیاؤں میں منادی
کی۔ بعد ازاں اس کا اثر ہندوستان تک ہُوا۔ اور اس سے تعلق پیدا کر لینے کی وجہ
سے آج کے دن تک مالابار کے مسیحی لوگ سیرین کہلاتے ہیں۔ بعض لوگ اُنہیں
جیکوبائٹ بھی کہتے ہیں۔

ملک چین میں نسطوری مشنیں

نسطوری لوگوں نے اپنے مشنریوں کو ملک چین تک روانہ کیا۔ آٹھویں
صدی میں، سی گنانفو (SI-GNANFU) میں جسے جدید سائین فو (SI AN FU)
کہتے ہیں ایک استادہ کیا گیا تھا جسے بہت عرصہ کے بعد جزوائٹ (JESWIT)
مشنریوں نے ڈھونڈا تھا۔ اس پر ایک کتبہ ہے جو ہمیں ان مشنوں کا جو ملک چین
میں ۶۳۵، ۷۱۳ اور ۷۴۴ء میں بھیجی گئی تھیں ایک مختصر بیان پیش کرتا ہے۔
یہ مشنیں، بغداد کے قریب سلوکیہ استفان (SELEUCIA CTESIPHON)

کی کلیسیا کی طرف آئی تھی۔ وہاں کی کلیسیا پر ایک بشپ حکمران تھا جس کا لقب کیتھولیکوس (CATHOLICS) تھا۔ اس کتبے پر پچھتر ناموں کی ایک فہرست ہے جس میں ایک بشپ اور کئی پریسٹ اور راہب ہیں۔ ان پچھتر ناموں سے چند ناموں کے سوا باقی سب غیر چینی ہیں۔ چینی لوگوں کی تاریخی شہادتوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مسیحی، زرتشت (وہی لوگ جن کو زمانہ حال میں پارسی کہتے ہیں) مسلمان اور یہودی لوگوں کے سارے طبقہ کو بدیشی یا غیر ملکی کہتے تھے۔ ۸۴۵ء میں اس پتھر کے استادہ کئے جانے کے کچھ عرصہ بعد حکومت چین نے ایک فرمان جاری کیا جس کے مطابق مسیحی، زرتشتی اور بدھ مت کے سب راہب خانے بند کر دئے گئے۔ بدھ مت کے لوگوں کو اس معاملہ میں کچھ رعائت دی گئی۔ اس شہادت سے اور دیگر شہادتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نسطوری کلیسیا ملک چین میں کبھی بھی ملکی کلیسیا نہیں بنی۔ راہب خانے ہی اس کے بڑے بڑے ادارے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہی ڈکماٹین راہب خانوں کی طرح نہ تھے جو محنت و سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ ان میں عام راہبانہ مشقتیں ہوتی تھیں۔ چودھویں صدی کے ایک مشرقی مورخ نے مسیحی پیغام کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ عوام الناس کے لئے ایک بلاہٹ ہے کہ :-

"وہ اپنی گردنوں کو اطاعت و فرمانبرداری کے جوئے میں جوتیں اور روزہ دعا، شب بیداری میں مصروف رہیں اور مقررہ روزوں اور پاک تہواروں کے ایام میں ہر قسم کے طعام سے پرہیز کریں۔" مسیحی زندگی کے متعلق یہ بیان بے حد نامکمل ہے۔

ٹرانس اوکسانیہ (TRANSOXANIA)

ملک چین میں جب ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے تو ٹرانس اوکسانیہ

میں معاملہ کچھ اور صورت اختیار کر رہا تھا۔ یہ ملک دریائے اوکسس کے شمال میں واقع ہے اور یہ دریا شمال مغرب کی سمت میں بہتا ہے اور کوہ ہندوکش سے نکل کر بحر ارال میں جا گرتا ہے۔ یہ بہت الگ تھلگ اور گنجان ملک ہے۔ وہاں کی کلیسیائیں مرو کے میٹروپالیٹن کے زیر اہتمام تھیں۔ مرو اوکسس کے جنوب میں بغداد اور لاہور کے مرکز میں ایک شہر ہے جو ان مقامات سے کچھ شمال کی طرف واقع ہے۔ یہ مقام نسطوری علم و ہنر کے تین نامور مراکز میں سے ایک تھا۔ دیگر دو مراکز میں ایک نسیبس جو جدید موسل کے شمال میں واقع ہے اور دوسرا جندیسبر ہے جو جدید بصرہ کے شمال میں واقع ہے۔ آٹھویں صدی میں ان شہروں سے مسلمانوں نے کل فلسفہ اور سائنس کے علوم نسطوری لوگوں سے حاصل کئے تھے۔ جو وہ انہیں سکھا سکتے تھے۔ کلیسیا ابھی تک شمال کی سمت میں پھیل رہی تھی تمتھیس سیلوسیہ استفان کا کیتھلیکس تھا۔ ۷۸۱ء میں (اسی سال مسلمان قسطنطنیہ پر قبضہ جمانے میں ناکامیاب ہوئے۔ (ملاحظہ ہو باب آٹھ)۔ رقمطراز ہے کہ اُس نے شمال کی طرف کے مسیحیوں کے لئے ایک نیا میٹروپالٹین تقدیس کیا ہے اور وہ تبت کے لئے بھی ایک میٹروپالیٹن تقدیس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگلی صدی میں یعنی نویں صدی میں اسلام کی قوت ان ممالک میں بڑھتی رہی اور مسیحی لوگ مغلوب ہوتے گئے۔ مسلمان جو پہلے شاگرد تھے۔ اب اُستاد بن چکے تھے اور اُنہوں نے چھ صدیوں تک اس علم کا تحفظ کیا جو اس درمیانی عرصہ میں معدوم ہو چکا تھا۔

کریت قوم (THE KERAITS)

گیارہویں صدی کے شروع میں، تقریباً ۱۰۰۷ء میں، مرو کے میٹروپالٹن

نے سیلوسیہ اسِتفان کے کیتھلیکس کو کریت کی چند اقوام کی امداد کے لئے لکھا۔ یہ قومیں جھیل بیکل (LAKE BAIKAL) کے کناروں پہ بہت دُور ملک چین کے شمال میں مقیم تھیں۔ ان کریتوں نے مسیحیت کا احوال اِدھر اُدھر گردش کرنے والے سوداگروں کی زبانی سُنا تھا اور اُنہوں نے مرو کے میٹروپالیٹن کو اُستادوں کے لئے درخواست کی تھی۔ اس قسم کے عام لوگ ان مقامات میں رہتے تھے اور وہ پھل اور سبزیوں کے بغیر محض دُودھ اور گوشت پر گزارہ کرتے تھے۔ میٹروپالیٹن کے سامنے ان لوگوں کے متعلق ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ لوگ روزہ کیسے رکھ سکتے ہیں۔ کیتھلیکس نے وہاں کے لوگوں کے نام روزہ رکھنے کی ہدایات روانہ کیں —— اور ایک پریسبٹ اور ایک ڈیکن کو بھی روانہ کیا کہ وہ اُن لوگوں کو تعلیم دے اور بپتسمہ بھی۔ ماننے کثیر التعداد لوگوں کو تعلیم دینا محض ایک نام نہاد بات تھی۔ چنانچہ ان لوگوں میں تبدیلیٔ زندگی کا احساس پیدا کئے بغیر بپتسمے دیئے گئے ہم حیران ہیں کہ کس طرح ان اقوام کی زندگی میں کلیسیا زندہ رہ سکی۔ ہمارے مطالعہ میں یہ بات آتی ہے کہ تقریباً ۲۵۰ سال کے بعد یعنی ۱۲۵۸ء میں بغداد کا جو گورنر مقرر کیا گیا تھا ایک کریت مسیحی تھا۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہی۔

اہلِ اسلام اور مسیحی

گیارہویں صدی میں (جیسا کہ ہم نے نویں باب میں پڑھا ہے) ترکوں نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا اور اُن کے یروشلم پہ قابض ہونے کے بعد صلیبی جنگیں شروع ہو گئیں۔ صلیبی جنگوں سے مشرقی کلیسیا ڈنہ پر بالواسطہ اثر

ہُوا۔ بارہویں صدی میں ساری کی ساری کلیسیائیں بدستور قائم رہیں جس طرح وُہ سلجوکوں کے حملہ سے قبل تھیں۔ مسیحی اپنے مسلمان پڑوسیوں کے ساتھ بے تعصب معقول اور دوستانہ تعلقات رکھتے ہُوئے زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی مسیحی ایمان کے متعلق سماعت کرنے سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ وُہ مسیحیوں کو عام طور پر للکارتے رہتے تھے کہ وُہ اپنے ایمان کی تشریح کریں۔ مسیحی لوگ اگرچہ اپنے ایمان میں پکے تھے تاہم وُہ اپنے ناحکمین سے "یعنی حکام طبقہ" سے دہشت زدہ رہے اور انہوں نے ایسے ڈرپوک اور غیر یقینی طور سے اپنے ایمان کی گواہی دی کہ اُن کے دلائل سامعین کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کا مُوجب ٹھہرے۔ ڈاکٹر ایل۔ ای۔ براؤن صاحب اِس موضُوع پر لکھتے ہیں کہ:۔

"مسلمان ہی خُود بخُود بحث و مباحثہ کے موضوعات کا انتخاب کرتا تھا اور مسیحی اس کے اثبات سے اثر پذیر ہو کر حالتِ نوم میں آ گئے تھے اور یُوں اُنہوں نے اپنے مخالفین کو اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وُہ میدانِ مناظرہ میں پہلا قدم اُٹھائیں۔ ان کے لئے بجا ہوتا کہ وُہ خُود ہمت و استقلال سے ان پر وار کر کے اُنہیں متاثر کرتے اور اُنہیں انجیل کا پیغام دیتے۔ عام طور پر ہمارا مشاہدہ ہے کہ مسیحی لوگ ایسی دلائل استعمال کرتے ہیں جن کا سرے کی مدعا مسلمانوں کو تبدیل کرنا نہیں ہوتا بلکہ وُہ محض ناخوشگوار التفات سے اپنا پلہ چھڑانا چاہتے ہیں۔"

(ماخوذ از ایکلپس آف کرسچینیٹی ان دی ایسٹ)

ان مناظروں میں وُہ دلائل جنہیں مسیحی لوگ استعمال کرتے تھے، کتابِ مُقدس کے متن سے الگ شکل ہوتی تھیں اور جنہیں درست اقتباسات کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن وُہ ان حقائق کو ثابت نہیں کرتے تھے جن کے لئے

انہیں استعمال کیا جاتا تھا۔ کتابِ مقدس کا متن ایسے رنگ میں استعمال کیا جا سکتا ہے جس سے سچائی زیادہ عام فہم ہونے کی بجائے زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔ ہمارے خداوند یسوع مسیح نے یہ نکتہ فریسیوں پر ایک بحث میں ثابت کیا تھا۔ اس کا ذکر ہم مرقس باب بارہ ۱۲ میں مطالعہ کرتے ہیں۔ دراصل بہترین دلائل وہ ہوتی ہیں جن کو زندگی میں عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ مسیحی لوگ اہلِ اسلام کو اپنے ایمان کے متعلق یقین دلانے میں اس لئے ناکامیاب رہے کیونکہ انہوں نے درحقیقت کبھی بھی کامیاب ہونے کی سعی نہیں کی تھی۔ ہم بھی بعض اوقات انہی کی طرح عام کٹھن حالات میں ناکامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کسی قدر تتلاتی اور ہچکچاتی سی گواہی دی اور مسیحی زندگی کا ایک معیار قائم کیا۔

تیرہویں صدی میں آکسس (O.X US) کی دوسری جانب سے وحشیوں نے ایک تازہ حملہ کیا۔ چنگیز خان مغل نے دریا کو عبور کیا۔ اُس کے لڑکے نے میسوپوتامیہ آرمینیا اور جورجیا کو فتح کیا۔ دوسرے خان نے ان فتوحات کو اور بھی آگے تک بڑھا دیا۔ اس کے بعد دو بھائی آئے پہلا بھائی مشہور و معروف قبلا خان تھا جو مشرق کی سمت میں بڑھتا گیا اور چین میں منگولیہ خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان کی حینِ حیات میں مسیحیوں کو چین میں رہنے کی اجازت تھی لیکن جب ۱۳۶۸ء میں اس خاندان پر زوال آیا تو کلیسیا پر بھی اس کے ساتھ ساتھ زوال آگیا۔

دوسرا خان :-

دوسرا خان بھائی جہاں تھا وہاں مقیم رہا اور اُس کے خاندان کا ایک اور فرد اس کا جانشین بنا۔ اس کی حکومت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اُس نے

۱۲۵۸ء میں بغداد پر قبضہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خان جس کا نام ہلاکو خان تھا ایک وقت پر مشرف بہ مسیحیت ہونے کا متمنی تھا بشرطیکہ مسیحی لوگ اُس کے جادوگروں کو معجزات کرنے سے بند کر دیں اور وہ بت پرستوں پر اس طرح حاوی ہو جائیں، کہ اُن کے پاس کوئی قوت نہ رہے کہ وہ اُن کی موجودگی میں بت پرستی کے کام کر سکیں۔"

(ماخوذ از پرونر ایکلیس آف کرسچینیٹی ان دی ایسٹ صفحہ ۱۵۳)

معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا خان صاحبان مسیحیت اور اسلام کی قبولیت کے سلسلہ میں کشمکش و پیچ کی حالت میں تھے۔ وہ اس چیز کا جائزہ لینا چاہتے تھے کہ ایک دلیر انسان کے لئے کونسا مذہب بہتر ہو سکتا ہے۔ ہلاکو خان نے جب بغداد پر قبضہ کیا تو اُس نے مسیحیوں کو اکسایا کہ وہ مسلمانوں کو بے عزت کریں اور انہیں تکلیف دیں جس طرح وہ خود کئی پشتوں سے بے عزت ہوتے رہے اور تکلیف سہتے رہے تھے۔ مسیحیوں نے بصد شوق اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بعد ازاں ان خانوں نے اپنے سکے ڈھالے جن پر نشانِ صلیب کی ضرب لگائی گئی۔ وہ مسلمانوں سے کسی قدر متنفر تھے اور مسیحیوں کو بہتر سمجھتے تھے لیکن جب انہوں نے معلوم کیا کہ اُن کا مصر کی طرف بڑھنا دیار کے فرمانروا مملوک سلطان نے روک دیا ہے تو اُن کے دلوں میں اسلام کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔ بالآخر صلیبی جنگوں کے ذلیل و حقیر انجام نے اس عزت و احترام کو مٹا دیا جو ایک دفعہ اُن کے دلوں میں مسیحیوں کے لئے پیدا ہو چکی تھی۔ عوام نے بھی اس کی شدید مخالفت کی اور حاکم الوقت خان کو آمادہ کیا کہ وہ انہیں قتل عام کی اجازت دیں۔ یہ پہلی خونریزی سنہ ۱۲۱۰ء میں بمقام اربل ہوئی دوسری خونریزی سنہ ۱۳۱۷ء میں بمقام آمر ہوئی۔

ان واقعات کے بعد اسلام ظفریاب رہا اور مشرقی کلیسیا غیر مکمل حصص کی صورت میں قائم رہی۔ یہ حصص آرمینین، اسوری، ابی سینیا اور سیرین کلیساؤں پر مشتمل تھے۔

"انجیلِ مقدس محبت کے لئے پکارتی ہے۔ محبت میں ایماندار و منکر، قریب و بعید، دوست و دشمن سب شامل ہیں"
(بشپ آف لسی بس ۱۲۵۶ء)

چودھواں باب

مغربی اصلاحِ دین

زمانہ اصلاح سے قبل:-

مغرب میں وہ وقت آگیا تھا جب کلیسیا اور حکومت کے باہمی تعلقات اور ان دونوں کے ساتھ ایک مسیحی کے تعلقات کو قائم کرنے کے لئے ایک جدید معاہدے کی ضرورت لاحق تھی۔ مشرقی کلیسیا نے کبھی بھی ان حکومتوں کے ساتھ جہاں جہاں وہ پائی جاتی تھیں کوئی خاص تعلق پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا تعلق محض افراد ہی سے رہا۔ اس نے حکومت سے قطع تعلق ہی

رکھا۔ مشرقی کلیسیا اس بات سے مطمئن رہی کہ حکومت کو اجازت دے کر کلیسیا کے تمام دنیوی معاملات پر اختیار رکھے۔ صرف مغرب ہی میں کلیسیا نے حکومت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی اور اپنی احتیاج کے باعث اس کے جواب میں حکومت سے اثر پذیر ہوتی۔ مشرق و مغرب کی کلیسیاؤں کی حکومت سے گہرے تعلقات چوتھی صدی میں شروع ہوئے۔ جب کلیسیا اور حکومت نے مل کر کانسٹنٹائن کے سایۂ عاطفت کو قبول کیا۔ اس معاملہ نے اس وقت ایک نیا رخ بدلا تھا جب پوپ نے شارلی مین کی رسم تاجپوشی ادا کی اور دونوں نے یورپ کو مہذب بنانے کے لئے ایک دوسرے کی امداد کا اعلان کیا۔ سات صدیوں سے زائد عرصہ کے بعد پوپ اور شہنشاہ نے قوت حاصل کرنے کے لئے بے حد جدوجہد کی اور مقابلہ کیا۔ یہ جدوجہد ان دونوں کے اس متحدہ عمل سے زیادہ نمایاں طور سے نظر آتی ہے جو بدستور جاری تھا۔ اس متحدہ عمل سے کسی حد تک اس کے بنیادی خیال کو عملی جامہ پہنایا جا چکا تھا۔ دنیوی زندگی اور کلیسیائی زندگی کو کسی قدر ایک واحد حقیقت تسلیم کیا جا چکا تھا۔ قرون وسطیٰ کے ہنگامہ و اضطراب سے یورپ کی اقوام نکل چکی تھیں اور اپنے آپ کو مسیحی کہتی تھیں مگر عام طور سے مسیحی تعلیم کے بالکل خلاف عمل کرتی تھیں۔

اگرچہ رینے سینس (تنویر الافکار) کا زمانہ جدید معلومات اور جدید روشنی کا وقت تھا، تاہم یہ وقت طوفان و امتحان کا وقت بھی تھا۔ ہر ایک چیز کے متعلق استفسار کی جاتی تھی اور اسے پرکھا جاتا تھا۔ چاروں طرف جدید علم و ہنر پھیل چکا تھا اور نئے نئے خیالات عالم سکوت سے بیدار ہو گئے تھے اور وہ قدیم ناقابل اطمینان معاہدے جو کلیسیا اور حکومت کے مابین تھے ٹوٹ گئے تھے۔

پاپائے اعظم کا مطالبہ زر

وہ چیز جس نے حالات کو اور بگاڑ دیا اُن لوگوں کی بدکرداریاں تھیں جو اختیار و اقتدار کی گدّی پر بیٹھے تھے خصوصاً پوپ صاحبان کی زندگیاں، اُن کی دنیوی قوّت کے لئے ہوس، اُن کا کرّوفر اور اُن کی سازبازہ جب نیک لوگوں کو خطرناک اوقات سے دوچار ہونے کا امکان ہوتا ہے تو وہ اُن خطرات میں سے نکل جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ خطرات کی منزل سے نکلنے کی سعی میں جان بحق بھی کیوں نہ ہو جائیں وہ ان لوگوں کے لئے راستہ صاف کر دیتے ہیں جو اُن کے بعد آتے ہیں۔ لیکن بدکردار لوگ اگرچہ فی الحال فتحیاب کیوں نہ نظر آئیں وہ اپنی موت کے بعد مصیبتیں چھوڑ جاتے ہیں۔ رینے سینس (RENAISSANCE) کی تحریک کے قائدوں کا وسیع محل ویٹیکس اس زمانہ کے سب سے ماہر اور جلیل القدر نقاشوں کے ہاتھ سے سجایا گیا تھا۔ انہوں نے قدیم مجسموں کو جمع کیا جو ابھی تک روم کے حسن و جمال کی ایک تصویر ہے۔ آج کے دن تک ان کا کتب خانہ دنیا کے بہترین کُتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا دربارِ شاہی بے حد عظیم الشان تھا اور وہ یورپ کی ہر ایک حکومت سے سازباز کرتے تھے۔ ان تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لئے انہیں مال و زر کی ضرورت رہتی تھی اور وہ اس رقم کو ہر ایک طریق سے جو وہ سوچ سکتے تھے، پیدا کرتے تھے۔

روپیہ کے مسلسل مطالبہ کے خلاف، جو پاپائے روم کی طرف سے کیا جاتا تھا، تمام یورپ میں ایک زبردست شور و غل پیدا ہوا۔ زمانۂ قدیم کے بعض پوپ صاحبان بھی بد اخلاق زندگیاں بسر کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے عوام کا اخلاقی جذبہ اُن کے خلاف بھڑکنے لگا۔ ان میں ایک پوپ نے جس کا نام

لیو دہم (LEO X) تھا، رُوم میں سینٹ پیٹرس کے گرجے کو تعمیر کیا جو دنیائے مسیحیت کے عظیم ترین گرجوں میں سے ایک گرجا ہے۔ ایک طریق جس سے اس کام کے لئے روپیہ جمع کیا گیا تھا عفوِ گناہ کی فروخت کا انتظام و اہتمام تھا۔ اس سے نیک لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو گئی کیونکہ ۱۵۱۷ء میں یہ معافیاں پوپ کے عہدہ داروں کے ذریعہ جرمنی میں فروخت کی گئیں۔

مارٹن لوتھر ۱۴۸۳ء۔ ۱۵۴۶ء

ان لوگوں میں سے جنہوں نے بڑے زور و شور کے ساتھ اس بدکرداری کے خلاف احتجاج کیا ایک جرمن راہب تھا جس کا نام مارٹن لُوتھر تھا (۱۴۸۳ء۔ ۱۵۴۶ء)۔ اُس نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے زبردست طریق سے کیا کہ پوپ نے اُسے حکم دیا (جسے "بل" کہتے ہیں۔ لفظ "بل" کا مطلب مہر ہے) کہ وہ خاموشی اختیار کرے۔ لُوتھر نے اس حکم کو ۱۵۲۰ء میں علانیہ طور سے جلا دیا۔ اُس کا یہ فعل پراٹسٹنٹ اصلاحِ دین کی ابتدا تصوّر کیا جاتا ہے۔

ان ایام میں جرمنی چند ریاستوں پر مشتمل تھا جو سب کی سب ایک شہنشاہ کے زیرِ نگیں تھیں۔ بعض راجگان نے جو ان ریاستوں پر حکمران تھے، پوپ کے خلاف لُوتھر کا ساتھ دیا تھا۔ دُوسروں نے پوپ کا ساتھ دیا تھا اور ان میں شاہنشاہ بھی شامل تھا۔ اس معاملہ سے جو جھگڑا اُٹھا وہ کسی قدر مذہبی اور کسی قدر سیاسی رقابت پر مبنی تھا۔ چشم زدن میں یہ آگ سارے یورپ میں پھیل گئی اور بہت سے ممالک پوپ اور رُومی کلیسیا سے علیحدہ ہو گئے۔ بہت سے حالات میں انہوں نے بشپوں سے بھی اپنے تعلقات منقطع کر لئے۔ بشپوں نے رُوم سے اپنی شراکت برقرار رکھی۔ اُن کے ساتھ بلا تفریق لوگ بھی تھے لیکن باقیوں

نے ایک نئی تنظیم کا اہتمام کیا۔ انگلستان میں بشپ صاحبان اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ اس لئے کہ کلیسیائے انگلستان ایک مستقل کلیسیا ہے۔ لوتھر کے علاوہ دیگر پروٹسٹنٹ مجدد بھی تھے بخصوصاً کیلون جو ایک فرانسیسی تھا۔ اور زیونگلی جو ایک سوئیس تھا۔ اور کالونسٹس۔ ریفارمڈ کلیسیاؤں میں سے پریسبٹیرین کلیسیائیں پیدا ہوئیں۔ یہ کام خاص طور پر ملک اسکاٹ لینڈ میں ہوا۔

مذہبی لڑائیاں (THE WARS OF RELEGION)

ان جھگڑوں سے اذیتوں کا ایک دور پیدا ہوا اور جنگ وجدل کی شمشیر برہنہ چمک اٹھی۔ ان مذہبی لڑائیوں کا احوال مسیحی تاریخ کلیسیا میں ایک شرمناک صفحہ ہے۔ جب ہم شہداء کی ہمت واستقلال کی داد دیتے ہیں تو ہمیں اس بات کا اقبال کر کے افسوس کرنا چاہیئے کہ وہ لوگ جنہوں نے انہیں موت کے گھاٹ اتارا انہوں نے اس مکروہ کام کو خداوند یسوع مسیح کے نام سے کیا تھا۔ علاوہ ازیں ہمیں افسوس کرنا چاہیئے کہ وہ لوگ جنہوں نے اذیتیں سہیں موقع پانے پر دوسرے لوگوں کو زخم کاری لگانے سے نہ چوکے۔ ہم اس دور کی جنگوں کو مذہبی جنگوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جنگیں دراصل ایسی جنگیں تھیں جن سے مغرب کی جدید اقوام نے اپنے آپ کو مستقبل طور سے قائم کیا۔ وہ قدیم معاہدوں سے علیٰحدہ ہو گئیں اور اپنے مذہبی نظم ونسق کو زیادہ تر سیاسی اغراض ومقاصد کی بنا پر منتخب کیا۔ شمالی اقوام تقریباً سب کی سب پراٹسٹنٹ ہو گئیں۔ جنوبی اقوام نے کچھ پس و پیش کے بعد روم کی اطاعت قبول کر لی۔ انگلستان کے لوگ تین سمتوں میں چل نکلے۔ بعض نے برِ عظیم کے مجددین کی طرح اسقفی تنظیم کو رد کر دیا اور اپنے آپ کو مختلف پراٹسٹنٹ جماعتوں میں منظم کر لیا۔ بعض نے پاپائے روم کے اقتدار اعلیٰ کو تھامے رکھا اور رومن کیتھولک شراکت میں قائم رہے۔ بشپ صاحبان اور کلیسیا کے

سب سے مقدم لوگوں نے پاپائے رُوم کے اقتدارِ اعلیٰ کو تو ٹھکرا دیا لیکن اُنہوں نے اُسقفی حکومت کو نہ چھوڑا اور اس کے ساتھ "تقدیس بوسیلہ ایمان" کے مسئلہ کو قبول کر لیا تاکہ وُہ بیک وقت پروٹسٹنٹ اور کیتھلک بننے کے مُدعی ہو سکیں۔ اس وقت سے یہی چیز کلیسیائے انگلستان کی اَور کچھ عرصہ سے انگلستانی شرکت کی خصوصیت ہے۔ موجُودہ زمانے میں جبکہ ایک واحد کلیسیا کا تصور، ہر ایک مسیحی فرقہ میں مسیحیوں کی فرمانبرداری کو اپنی طرف مائل کر رہا ہے تو موجُودہ حالات میں لفظ کیتھلک سے خلوت پسندی کا مفہوم غائب ہو رہا ہے متعدد کلیسیائیں جو سترویں یا اٹھارویں صدی میں اس لفظ کو غصہ اور تعصب کی وجہ سے استعمال میں نہیں لاتی تھیں اب اسی لفظ کی مُدعی ہیں۔

اسکاچ پریسبٹیرین اس خیال کے قائل ہیں کہ انہوں نے اپنے بنیادی تعلق کو اصلاحِ دین سے قبل کی کلیسیا سے برقرار رکھا ہے، کیونکہ وُہ بشپوں اور پریسبٹروں یا پریسٹوں کے مابین کی امتیاز کو تسلیم نہیں کرتے۔ سویڈن کی کلیسیا نے بھی اپنے تعلق کو برقرار رکھا ہے۔ یہاں کی کلیسیا کے بشپوں نے کلیسیائے انگلستان کی طرح، اصلاحِ دین کو قبول کر لیا ہے۔

سولہویں اور سترویں صدی کی جنگیں:-

ان جنگوں کے دو سلسلے تھے۔ پہلے سلسلے کا تعلق سولہویں صدی سے ہے۔ جب وُہ سلطنت جس کا پہلا بادشاہ شارلی مین تھا عملی مقاصد میں تباہ و برباد ہو گئی تو اُس کی سلطنت کا کثیر حصہ اس سے علیحدہ ہو گیا، اگرچہ آسٹریا کے فرمانروا نے تا ہنوز شہنشاہ کے لقب کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ دُوسرا سلسلہ سترویں صدی کا ہے جو تیس ۳۰ سالوں کی جنگ کے نام سے مشہوُر ہے۔ یہ جنگ زیادہ تر

سیاسی تھے اور ان کا مذہبی رنگ اُڑ چکا تھا۔ آخرکار ان کا خاتمہ ہوگیا اور طرفین میں سے ایک بھی فتحیاب نہ ہُوا اور کلیسیا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وُہ بے حد ناتوانی کے درجہ تک پہنچ گئی۔ طرفین نے اس بات کو ذہن نشین کر لیا کہ چاہے اُنہیں یہ بات پسند آئے یا نہ آئے اُنہیں ہمسائے بن کر رہنا ہوگا اور ایک دوسرے کی برداشت کرنا ہوگا۔ مذہبی اتحاد کبھی بھی سیاسی حکم سے از سرِ نو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

کتابِ مُقدّس کا ترجمہ:۔

پرخاش اور انتشار کے ان مناظر سے ایک نیا بقعۂ نُور نمودار ہُوا۔ یہ اصلاحِ دین کا ایک عظیم الشان کام تھا کہ کتابِ مقدّس کا ترجمہ یورپ کی تمام زبانوں میں کیا گیا۔ ان تراجم میں پہلا ترجمہ لُوتھر کے قلم سے ہُوا جبکہ وُہ اپنے دوستوں میں سے ایک کے محل میں چھپا بیٹھا تھا۔ اُس نے کتابِ مقدّس کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ابھی تک رائج ہے۔ فرنگی علما نے پہلے عہدِ جدید کا ترجمہ کیا اور بعد میں پُوری کتابِ مُقدّس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ تین تراجم سولھویں صدی میں کئے گئے۔ ایک اور ترجمہ ستارویں صدی میں ہُوا جو ابھی تک مستعمل ہے۔ دیگر تراجم دیگر ممالک میں کئے گئے۔ پراٹسٹنٹ کلیسیاؤں کا خاص کام کتابِ مقدّس کا مطالعہ کرنا اور اُس کی تفہیم حاصل کرنا تھا۔ جن ممالک میں یہ کام کیا گیا وہاں کتابِ مُقدّس کے مطالعہ کا بے حد اثر ہُوا۔ رُومی کلیسیا نے بھی کتابِ مُقدّس کا لاطینی سے انگریزی میں ترجمہ کیا لیکن اُنھوں نے شرکاءِ کلیسیا پر اس کے مطالعہ کا اتنا زور نہیں دیا جتنا کہ پراٹسٹنٹ کلیسیاؤں نے دیا تھا۔

ایراسمس (ERASMAS 1466-1536)

اس دور کا ایک اور عظیم الشان کام یہ تھا کہ کتاب مُقدّس کا مطالعہ اصلی زبانوں میں از سر نو جاری کیا گیا۔ متعدد علما نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا۔ ان علما میں ایراسمس بھی ایک درخشندہ ستارہ تھا (۱۴۶۶ء-۱۵۳۶ء)۔ ۱۵۱۶ء میں اس نے یُونانی عہدِ جدید کی ایک جدید ایڈیشن کو طبع کیا جو اُس زمانے کا ایک بہترین تحفہ تھا۔ ہسپانیہ کے رومن کیتھلک لوگوں نے بھی ایک ترجمہ شائع کیا لیکن یہ ترجمہ ہر دلعزیز نہ ہو سکا۔ ان علما نے اس نا تمام کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا جسے اوریجن نے تیرہ سو سال قبل اُدھورا چھوڑ دیا تھا (ملاحظہ ہو باب دوم)

رُوم :-

اصلاحِ دین کا اثر رُومی کلیسیا کے اندر اور باہر دونوں مقامات پر ہوا۔ رومی دربار میں ایک زبردست اصلاح ہُوئی اور اُس وقت سے ہمیں ایسے پوپ صاحبان نظر آتے ہیں جن کے اعلیٰ کردار اور پاک زندگیاں تھیں۔ جزوِیٹ (JESWIT) پادریوں کا حلقہ اسی غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ اُس کے وسیلے پراٹسٹنٹ لوگوں کو رُومی کلیسیا میں واپس لایا جائے۔ بعض ممالک میں خاص طور پر فرانس اور ہسپانیہ میں جزوِیٹ حلقہ کو کامیابی ہُوئی اور اطالیہ میں بھی اُسے کسی قدر کامیابی حاصل ہُوئی۔

کونسل آف ٹرنٹ (THE COUNCIL OF TRENT)

ایک عظیم الشان کونسل بمقام ٹرنٹ منعقد ہُوئی تاکہ ان اصطلاحات کو

عملی جامہ پہنائے۔ کونسل نے زیر بحث نکات کے متعلق عقیدہ کی تعریف بھی پیش کی۔ یہ جدید کلیسیا رُوم کے دستور العمل کی ابتدا ہے۔

کلیسیا کی ترقی کے لئے اصلاح کی اشد ضرورت تھی۔ اگر کلیسیا مجموعی طور سے اپنی ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانے کے لئے زیادہ ایماندار ہوتی تو وہ برکات جو اصلاح دین اپنے ہمراہ لائی تھی بغیر کسی نقصان کے اس تک پہنچتیں۔ تاہم ان حالات میں بھی کلیسیا کو نئی سچائی کی برکت دی گئی خصوصاً سچائی کا وہ چشمہ جو ازمنۂ وسطیٰ میں کھو گیا تھا اب کتاب مقدس کے ازسرِ نو مطالعہ سے پھوٹ نکلا۔ وہ اہم سبق جو مصلحین نے دُنیائے عالم کو یاد دلایا تھا کہ ہمیشہ کی زندگی کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمایا جا سکتا ہے بلکہ یہ خُدا کی بخشش ہمارے خداوند یسوع مسیح میں ہمیشہ کی زندگی ہے۔ (رُومیوں ۶: ۲۳)

ان مسیحی لوگوں کے گناہ نے جو اقتدار و اختیار کی گدیوں پر بیٹھے تھے ان برکات کے ساتھ ساتھ تقسیم کلیسیا کا سیاہ بھوت بھی دکھایا۔ مغربی کلیسیا اس طوفانی دور سے منوّر ہو کر ایک منقسم حالت میں ظاہر ہوئی۔

"میں اس مقام پر جم کر کھڑا ہوتا ہوں اور میں اس کے سوا کوئی دوسرا قدم نہیں لے سکتا۔ اے خدا میری مدد کر۔" آمین

(یہ الفاظ مارٹن لوتھر سے منسوب ہیں)

"میری آرزو ہے کہ کمزور ترین عورت بھی انجیل مقدس کا مطالعہ کرے۔ اُسے چاہیئے کہ مقدس پولُس کے خطوط کا مطالعہ کرے۔ کاش کہ یہ خطوط دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہوتے تاکہ ان کا مطالعہ اور ان کی تفہیم نہ صرف اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے باشندے ہی حاصل کرتے بلکہ ترکستان اور عربستان کے لوگ بھی ان کے مطالعہ سے مستفید ہوتے۔ کاش کہ کسان، جونہی وہ ہل کے پیچھے

پیچھے چلے ان کے حصص کو گا گا کر اپنے آپ کو خوش کرے اور جو لاما ان کی گنگناہٹ کو اپنی نئی کی آواز کے ساتھ ملائے اور مسافر اپنے سفر کے شروع میں ان کہانیوں سے اپنے دل کو بہلائے " (ابراسمس)

پندرواں باب

مشنری بیداری

سولہویں صدی سے قبل کی مشنیں:-

مغرب کی بشارت کا کام، جیسے کہ ہم ساتویں باب میں دیکھ چکے ہیں، اندازاً دسویں صدی میں پورا ہو گیا۔ لیکن ایشیا کی بشارت کا کام تاہنوز گیارھویں صدی میں نسطوری لوگ چلا رہے تھے، اگرچہ یہ کام مردہ دلی سے کیا جا رہا تھا۔ اس صدی میں اور اگلی دو صدیوں میں مغربی کلیسیا کی قوتیں صلیبی جنگوں میں صرف ہو رہی تھیں۔ بشارتی نقطۂ نظر سے صلیبی جنگیں ناکامیابی سے بھی بدتر چیزیں تھیں۔ لیکن اس دور میں بھی سچے مشنریوں کا سلسلہ جاری رہا۔ فرانسس آف اسیسی نے سرزمین مصر کی طرف ایک بشارتی سفر کیا اور سلطان مصر کو انجیل کا پیغام دیا اور دوبارہ اپنا کام سنبھالنے کے لئے واپس آ گیا۔ اس کے راہبی حلقہ کا ایک شریک تھا جس کا نام رائمن لل (RAIMAN LULL) تھا۔

اس نے صلیبی جنگوں کی ناکامیابی کو تسلیم کرتے ہوئے کچھ عرصہ کے بعد اہل اسلام میں مشنری کام کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کام کیلئے اپنی زندگی پیش کر دی۔ اس نے اپنی مشن کے مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے شمالی افریقہ کی طرف کئی سفر کئے اور اپنے ملک میں کلیسیائی کام پر زور دیا۔ اُس نے کلیسیا کو آمادہ کیا کہ چند یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کے مطالعہ کا اہتمام کریں۔

تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں فرانسسکن مشنری تمام ایشیاء میں گئے۔ بغداد کے فرمانرواؤں اور خانوں نے اُن کا خیر مقدم کیا اور (جیسے کہ ہم دیکھ چکے ہیں) وہ بڑی بیتابی سے اُن کی طرف متوجہ ہوتے اگر اُن کے دل میں صلیبی مجاہدوں سے نفرت نہ ہوتی۔

ایک مقتدر فرانسسکن مشنری بنام جان ڈی کار و ینو (JOHN DE CORVINO) ملک چین میں ۱۲۹۴ء سے ۱۳۳۰ء تک کام کرتا رہا۔ یہ وُہی زمانہ تھا جب مذکورہ خانوں نے مسیحیوں کی حفاظت کی۔

سولھویں صدی :-

جب ہسپانوی لوگ مغرب کی طرف بڑھے اور پرتگالی لوگ مشرق کیطرف تجارت یا سلطنت کی تلاش میں چل نکلے تو انہوں نے اس امر کو تسلیم کیا کہ وُہ ممالک جو انہوں نے فتح کئے ہیں یا وُہ ممالک جن کے ساتھ وُہ تجارت کرتے ہیں انہیں کلیسیا کی حکومت آجانی چاہیئے۔ وُہ پریسٹوں اور راہبوں کو اپنے ہمراہ لے کر امریکہ اور ہندوستان کی طرف گئے۔ ان میں بعض عوام کی نگہبانی کے لئے حکومت کے کارندوں سے کچھ ہی بہتر تھے لیکن باقی کے لوگ خدا رسیدہ تھے۔ ملک امریکہ میں ہسپانیہ کے فاتحین نے وہاں کے باشندوں سے بڑا ظالمانہ سلوک

کیا۔ انہیں غلام بنا کر کھیتوں میں کام پر لگا دیا۔ ایک ہسپانوی ڈومنیکن راہب بنام لاس کاسٹس نے اس بدکاری کے خلاف جہاد شروع کر دیا اور اپنی زندگی عوام الناس کی امداد و بہبود میں صرف کی تاکہ وہ انہیں اپنے ہموطنوں کے ہاتھوں سے خلاصی دلائے۔ (جزویٹ (JESWITS) بھی ان کی امداد میں کوشاں رہے اور انہیں کھیتوں میں جمع کر کے تعلیم دیتے تھے۔ مشرق میں فرانسس نے جو ایک امیر زادہ تھا اور جزویٹ راہب تھا عرصہ دس سال تک (۱۵۴۲ء سے ۱۵۵۲ء تک) خدمت کرتا رہا وہ ہندوستان، ملاکس اور جاپان میں گیا اور چین میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوا فوت ہو گیا۔

مالابار :۔

ہندوستان میں رومی مشنریوں کو موقع ہاتھ لگا کہ وہ بشارت کی بجائے خدمت کریں جب پرتگالی لوگ گوا میں آئے تو انہیں سریانی مسیحی ملے جنہیں دیکھ کر وہ حیران و سراسیمہ بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ یورپ کی کلیسیائیں کئی صدیوں سے ان کے وجود سے لاعلم تھیں۔ لیکن ان کی خوشی کافور ہو گئی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان میں اور سریانی لوگوں میں بے حد اختلاف ہے۔ ان کے پادری شادی شدہ تھے۔ ان کی رسوم رومی لوگوں سے فرق تھیں، اور وہ پوپ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس تفاوت کا انجام یہ ہوا کہ ان کے مابین جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اور آخر کار رومی لوگوں نے وہ جبر ذریعہ اور قوت سے حاصل کر لی جسے وہ انہیں قائل کر کے حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے سریانی میٹروپالیٹن کو ترغیب دی کہ وہ روم کو روانہ ہو اور پوپ سے ملاقات کرے۔ انہوں نے اسے واپس آنے سے روکے رکھا جبتک اس کا آرچ ڈیکن

جو سرزمین ہند میں اس کا قائم مقام تھا رضا مند نہ ہوا۔ یاتم پور کی سنڈ میں جو ۱۵۹۹ء میں منعقد ہوئی وہاں سریانی کلیسیا نے روم کی اطاعت قبول کر لی۔ انہوں نے یہ قدم اپنی مرضی کے خلاف نہیں اٹھایا تھا۔ چون سالوں تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن ۱۶۵۳ء میں سریانی کلیسیا کے ایک ممتاز طبقہ نے ایک تازہ کوشش کی اور رومی حکمرانی و تسلط کو اٹھا کر پھینک دیا۔ اس واقعہ کو کونین کراس سکیشن (COONEN CROSS SUCCESSION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سولھویں اور سترھویں صدیوں کی رکاوٹیں:۔

اصلاحِ دین کے بعد کافی عرصہ گزر گیا اور کسی بھی تجدید شدہ یا اصلاح شدہ کلیسیا نے اپنی بشارتی بلاہٹ کے کام کو محسوس نہ کیا۔ ابتدائی مُصلحین نے مشنری کام کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ درحقیقت فرانسیسی مجدد کیلون (CALVIN) نے اس امر کا انکار کیا ہے کہ بشارت ایک فریضہ ہے۔ اس کی توجہ کسی اور کام کی طرف مبذول ہونے کی بجائے تنازعہ للبقا پر لگی تھی چنانچہ سترھویں صدی کے اختتام تک محض رومی کلیسیا نے مشنوں کے کام کو جاری رکھا۔

اس دوران میں تقسیم شدہ کلیسیا کا ہر ایک حصہ اس بلاہٹ کیلئے بیدار ہو گیا اپنے اپنے بشارتی فرض کو پورا کرنے میں کوشاں ہو گیا تاہم کسی شے کے اجزا مل کر کل کو وجود نہیں دیتے کیونکہ ہر جزو دوسرے جزو کی عنایت کا محتاج ہے۔ ہم ساتویں باب میں پہلے ہی اس امر کا جائزہ لے چکے ہیں کہ کس طرح مشرقی کلیسیا کی جدوجہد کے علاوہ نسطوری کلیسیا ایک زندہ اور قائم رہنے والی کلیسیا کو تعمیر کرنے میں ناکامیاب رہی۔ رومی مشنیں بھی جن پر ہم غور و خوض کرتے رہے ہیں، اس معاملہ میں کسی قدر ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ بعض کلیسیائیں جو انہوں نے قائم

کی تھیں غائب ہو گئی تھیں اور متعدد کلیسیا میں دوبارہ بت پرستی میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ اگرچہ ان کی بت پرستی مسیحی رنگ و روپ کی تھی کنواری مریم کی شبیہ نے یا کسی اور مقدس نے ایک مشرک بت کی جگہ لے لی ہے اور یوں مسیحی عبادت طلسمی رسم و رسوم میں بگڑ چکی ہے۔ اس قسم کا کام خاص طور پر جنوبی امریکہ کے چند حصوں میں ہوا ہے جہاں رومی کلیسیا کی زندگی کو بعض اوقات بت پرستی سے امتیاز کرنا مشکل ہے۔ ابتدائی زمانہ کے مشنری صاحبان نومریدوں کو بپتسمہ دینے کے لئے اتنے آرزو مند تھے کہ انہوں نے کثیر التعداد لوگوں کو بپتسمہ دے دیا تھا۔ بعض اوقات انہوں نے اس کام کو بہت تھوڑی تیاری یا تربیت سے کیا تھا۔ چنانچہ بعد ازاں ان کے نومرید آزمائش یا اذیت کے مقابلہ میں ناکامیاب رہے۔

جنوبی ہند میں مدورا شہر کے اندر چند مشنریوں نے برہمنوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا تجربہ کیا اور مسیحیت کی تعلیم دی اور اُسے ہندومت کی ایک تکمیل شدہ صورت میں پیش کیا۔ انہوں نے بہت زیادہ نومریدوں کو بپتسمے دئے لیکن جب اُن نومریدوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ مسیحیت کا اقبال کرنے سے اُنہیں اذیت دی جائیگی تو ان میں سے بہت سے نومرید مسیحیت سے منہ موڑ گئے۔

رومی کلیسیا نے اور بعض اوقات دیگر کلیسیاؤں نے بھی عام طور پر نومرید بنانے کے لئے حکومت کا اثر و رسوخ استعمال کیا ہے۔ فرانسس زیویر نے (FRACISXVIER) جو کہ ایک غیر جانب دار شخص تھا اور اپنی دنیوی عزت کے لئے غیر طرفدار تھا۔ پرتگال کے بادشاہ کو لکھا۔

"جب تک وائسرائوں اور گورنروں کو ناراضی کے خوف سے مجبور نہ

کیا جائے۔ کہ وہ مسیحیت کے لواحقین کو جنہیں، جہاں پناہ اس امر کی توقع نہ کریں کہ ہندوستان میں انجیل کی بشارت سے کوئی معقول کامیابی پیدا ہوگی یا بہت سے بپتسمے ہونگے"۔ کلیسیا کو ابھی یہ سبق سیکھنا ہے کہ اس طریق سے خدا کی بادشاہت نہیں پھیلتی۔ کلیسیا کو شائد یہ مشکل سبق سیکھنا ہے لیکن یہ سبق ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو اپنے کام کو نامکمل حالت میں چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ ان لوگوں کو ملامت کریں جو اس کام میں غلطیاں کرتے ہیں۔ رومی مشنوں کی خاص دعوت ان کی تنظیم میں پنہاں ہے۔ یہ تنظیم ستارہویں صدی میں "پروپیگنڈا فائڈ" (POPAGANDA FIDE) کی مستقل بنیاد پر قائم کی گئی تھی۔ یہ ایک مرکزی جماعت ہے جو اس تنظیم کا اہتمام کرتی ہے۔ کسی دوسری کلیسیا یا کلیسیاؤں نے اس قسم کے اتحاد کا خاکہ اور عملی قابلیت حاصل نہیں کی۔

اینگلیکن مشنیں :-

انگریزی کلیسیا، جس نے مستقل حکومت کو قائم رکھا ہے اصلاح شدہ کلیسیاؤں میں سے پہلی کلیسیا تھی جس نے مشنری کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس کو یہ کام شروع کرنے کی کلیسیا کی ذمہ داری کے لئے کرنا پڑا جو ستارہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں بڑی بھاری تعداد میں آبادکار یا تاجر ہو کر غیر ممالک کو جا رہے تھے۔ جب یہ کام شروع کیا گیا تو بت پرستوں کو بشارت دینے کے کام نے کلیسیا کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ اس سلسلہ میں ایس۔ پی۔ سی کے اور ایس۔ پی۔ جی اور تقریباً نوّے ۹۰ کے بعد سی۔ ایم۔ ایس اور دیگر سوسائٹیوں نے انجیل کے کام کو ساری سلطنت برطانیہ اور اس کی حدود سے باہر جاری رکھا۔

دیگر پراٹسٹنٹ مشنیں :-

اٹھارھویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے لئے ڈنمارک کی مشن شروع کی گئی۔ اس وقت سے لوتھرن (LUTHRAN) کانگر گشنیلسٹس (CONGREGATIANALISTS) بپٹسٹس (BAPTISTS) پریسبیٹیرین (PRESBYTERIAN) میتھوڈسٹ (METHODISTS) اور بہت سے دیگر لوگوں نے دُنیا کے تمام حصّوں میں یکے بعد دیگرے مشنیں بھیجیں۔ ہر ایک کلیسیا کی مشنری فہرست پر ایسے ایسے لوگوں کے نام ہیں جن پر ہم سب فخر کریں گے۔ جزوائٹ نے ریڈ انڈین لوگوں میں، ایڈونیرام جڈسن (ADUNIRAM JUDSAN) نے اہل برما میں، ولیم کیری (WILLIAM CAREY) نے بنگال میں، ڈیوڈ لوینگسٹن (DAVID LIVINGSTONE) نے افریقہ میں، جان کولرج پیٹیسن (JOHN COLERIDGE PATTISON) نے بحرالکاہل میں بشارتی کام کیا۔ ان کے علاوہ بے شمار دیگر مجاہدین تھے جن کا تعلق ایک ہی فرقہ سے نہیں تھا بلکہ وُہ کلیسیائے عالمگیر کے شرکا تھے۔

"ہم کبھی بھی نہ بہت زیادہ اعتقاد اور نہ ہی بہت زیادہ اُمید رکھ سکتے ہیں۔"

(ہنری مارٹن - شمالی ہند - اُنیسویں صدی)

سولھواں باب

مغرب میں مذہبی اور فیاضانہ بیداری

اٹھارہویں صدی:-

جبکہ کلیسیا کا بشارتی کام مشرق اور مغرب میں نئے نئے طریقوں سے وجود میں آرہا تھا، مغرب کی کلیسیا بے حسی کی حالت میں تھی۔ سترہویں صدی کا اختتام بے حد سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ اس دور میں بہت سے لوگ تھے جو عمل اور پاکیزگی کے لحاظ سے بڑے ممتاز المرتبت تھے اور عوام کو تعلیم دیتے تھے اور منادی کرتے تھے۔ بہت سی عبادتی کتب جو ابھی تک استعمال کی جاتی ہیں، اُس وقت سے چلی آتی ہیں۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ کلیسیائی عبادت محض دستور و رواج ہی رہ گئی اور پاک شراکت کی رسم کبھی کبھی ادا کی جاتی تھی اور علم محض ایک خشک استدلال کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ کلیسیاؤں کو کوئی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ اور غربا اور جہلا محتاجی اور بدی میں غرق ہو رہے تھے۔ مشنری کام کی تجدید کے سوا جس کا جائزہ ہم پچھلے باب میں لے چکے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغربی کلیسیا آخری سانس لے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ کلیسیا زمانۂ اصلاح کی بڑی جدوجہد اور تکلیفات کے بعد تھک کر چُور ہوگئی تھی۔

پائٹسٹس - ریڈرز اور موریوئین

(MORAVIAN)-(READERS)-(PIETISTS)

اس کے بعد ایک نئی تحریک شروع ہو گئی۔ یہ جرمنی اور سویڈن میں پیدا ہوئی جہاں پائٹسٹس (تحریکِ تقویٰ کے حامی) اور قارئین (READERS) نے کتابِ مقدس کا نئے سرے سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور سخت ترین ضابطۂ زندگی کی مشق کرنے لگے۔ موریوین (THE MORAVIANS) نے بوہمیا (BOHEMIA) کو چھوڑ دیا اور سیکسنی (SAXONY) میں بس گئے یہ ملک جرمنی میں ہے۔ اُنہوں نے خاص طور پر مشنوں کی طرف توجہ دی اور آج کے دن تک ان کا عظیم ترین کام یہی رہا ہے۔ وُہ ایسے مقامات میں جاتے ہیں جہاں کوئی دُوسری مسیحی جماعت مصروفِ خدمت نہیں ہوتی۔

جان ویسلی (JOHN WESLEY 1703-1791):-

اس دَور کا مجاہد ایک انگریز بنام جان ویسلی ہے (۱۷۰۳-۱۷۹۱) ابھی وُہ کالج ہی میں تھا کہ اس نے اور اس کے چند دوستوں نے ایک خاص طریقِ زندگی کا منصوبہ باندھا۔ (جس کی وجہ سے وُہ میتھوڈسٹ کہلاتے ہیں) دُعا اور کلیسیائی عبادتوں میں حاضر ہونے کے لئے ان کے باقاعدہ اوقات تھے اور وُہ ہفتہ وار شراکتوں میں حصّہ لیتے تھے۔ وُہ قیدیوں اور بیماریوں کو ملتے تھے اور بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ بعد ازاں ویسلی کا تقرر ہوا اور وُہ ملک امریکہ میں نو آباد کاروں اور ریڈ انڈین لوگوں میں خدمت کرنے کے لئے چلا گیا۔ دراصل یہ اس کی قدرتی بلاہٹ نہ تھی چنانچہ وُہ واپس انگستان کو

لوٹ آیا۔ اس کے بعد اسے ایک مکمل تبدیلی زندگی کا تجربہ حاصل ہُوا اور اس نے محسُوس کیا کہ اس کی صحیح خدمت لوگوں میں منادی کرنا ہے جن کی طرف پادریوں نے تغافل برتا ہے۔ اور انہیں بدی اور جہالت میں سرتاپا ڈوبنے دیا ہے۔ زندگی کے ایک طویل عرصہ تک وُہ گھوڑے پر سوار ہو کر ملک میں اِدھر اُدھر سفر کرتا، منادی کرتا، تنبیہہ دیتا اور سب کو تسلی وتشفی دیتا تھا۔ وُہ لوگ جنہوں نے اس کی طرف بڑی سرعت سے توجہ دی عام طور پر ایسے اشخاص تھے جو دُوسروں کی نگاہ میں بے حد لاعلاج گنہگار تصور کئے جاتے تھے۔ لیکن بہت سے اور لوگ بھی اس کی وساطت سے نئی زندگی حاصل کرنے کے لئے بیدار ہُوئے۔ کلیسیا کے رہنما سب سے آخر میں بیدار ہُوئے اور ایک خاص بات کے متعلق اُنہوں نے اس کی سماعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت نوآبادیوں میں انگریزی کلیسیا کے بشپوں کی شدید ضرورت تھی لیکن انگلستان کی کلیسیا اس ضرورت کو پُورا نہ کر سکی۔ ویسلی نے اپنے امریکہ کے قیام میں اس اہم ضرورت کو محسُوس کیا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ کلیسیائی حکام پر اس معاملے کے متعلق اثر پیدا کرے لیکن وُہ اس کام میں ناکامیاب رہا۔ بالآخر جب وُہ اُن کی سماعت حاصل کرنے میں ناکامیاب رہا تو اس نے لوگوں کے تقرر کے کام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی تاکہ وُہ تقرر شدہ خادم کی حیثیت میں ملک امریکہ میں جائیں۔ بعد ازاں یہی لوگ بشپ بن گئے۔ اُسقفی کلیسیاؤں کا یہ اصُول ہے کہ محض ایک بشپ ہی ایک پریسٹ کا تقرر کر سکتا ہے۔ ویسلی نے اس فعل سے انگلستانی کلیسیا کے بنیادی اصولات میں سے ایک اصول کو منقطع کر دیا۔ ایک سال کے بعد اسکاٹ لینڈ کی اُسقفی کلیسیا نے ایک بشپ کی تقدیس کی اور اُسے ملک

سے باہر روانہ کیا۔ اگر وُہ اس فرض کو ایک سال قبل پُورا کر دیتے تو انگلستانی کلیسیا اور میتھوڈسٹ لوگوں کے مابین جدائی پیدا نہ ہوتی۔ ویسلی اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اُس نے کسی قسم کی جدائی یا اختلاف پیدا کیا ہے۔ اپنی زندگی کے اختتام پر وُہ دعویٰ کرتا رہا کہ وُہ کلیسیائے انگلستان کا ایک شریک ہے۔ لیکن اُس کی مجلس کے شرکا اور انگریزی کلیسیا نے اس بات کو دُوسری طرح محسوس کیا۔ ایک دفعہ پھر کلیسیا میں ایک المناک شگاف پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن مُردہ دلی اور خشک زندگی کا دَور ختم ہو چکا تھا۔ جان ویسلی ہی اپنے زمانہ کا ایک زبردست مبشّر نہ تھا، تاہم وُہ بے حد موثّر مقرر تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں مذہبی بیداری بڑے زور و شور سے شروع ہُوئی۔ اس بیداری میں کچھ عرصہ تک انگلستان نے ایک امتیازی حصّہ لیا۔

مُعاشری بیداری :-

اس وقت انگریزی زندگی میں بہت سی بُرائیاں پائی جاتی تھیں۔ وُہ کام جو فرائرز (FRIARS) نے تیرہویں صدی میں کیا تھا اب اُسے دوبارہ کرنے کی ضرورت تھی۔ اس زمانہ کی جیلیں ہولناک حالت میں تھیں۔ اُن کی عمارتیں غلیظ اور تاریک تھیں اور وارڈن سخت ظالم، بداخلاق اور رشوت ستان تھے۔ لوگوں کو مقدمہ کی پیشی کے لئے دیر تک جیل میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ رشوت دئے بغیر وُہ معقول طعام و قیام حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ وُہ بخار اور غلاظت کی تکلیفات میں مبتلا رہتے تھے اور ان سے بعض کو دیواروں یا فرش کے زنجیروں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ ان نوجوانوں کو جن پر کسی چھوٹی سی غلطی کا الزام ہوتا تھا، سخت دل اور بڑے بدمعاش اور غنڈوں کے ساتھ

جنہوں نے تمام عمر جرائم میں بسر کی ہوتی تھی بند رکھا جاتا تھا۔ ایک شخص بنام جان ہاورڈ (JOHN HOWARD) پر جو کسی سلسلہ میں ایک جیل میں گیا اور اس نے ان ہولناک باتوں کو دیکھا، بے حد اثر ہوا۔ اُس نے اپنی بقیہ زندگی میں ملک میں اِدھر اُدھر دورے کئے۔ مجسٹریٹوں کو اُن مسائل کی طرف متوجہ کیا اور اُنہیں آمادہ کیا کہ وہ جیلوں کے اُن حالات کو درست کریں۔ اس سلسلہ میں اس نے نہ صرف انگلستان کے طول و عرض ہی کا دورہ کیا بلکہ وہ دیگر ممالک میں بھی گیا۔ اس کی کوششوں سے جیلوں میں زبردست اصلاح و بہبود کا کام شروع ہو گیا۔ تاہنوز غربا کے بچوں کے لئے کوئی مدرسے نہ تھے۔ جن جن بچوں کے والدین نیک نہیں تھے وہ مکمل جہالت میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان حالات میں غیر سرکاری لوگوں کے ہاں سوسائٹیاں تنظیم ہو رہی تھیں جو دیہاتوں میں مدرسے کھول رہی تھیں سنڈے اسکول شروع ہو گئے تھے اور خواتین نے قرب و جوار میں غربا کے لئے باقاعدہ کام شروع کر دیا تھا۔ یہ سوسائٹیاں بیماری میں ان کو سنبھالتیں، انہیں تعلیم دیتیں اور ان کے ہاں آتی جاتیں۔ عوام کو یہ بات سمجھ آ گئی کہ اپنے پڑوسیوں کو امداد دینا اور اُن سب لوگوں کی دیکھ بھال کرنا جو رنج و الم میں مُبتلا ہیں اور گناہگاروں کو بچانے کا کام کرنا مسیحی زندگی کا ایک حصّہ ہے۔

جبشیوں کی غلامی (NEGRO SLAVERY)

ایک اہم کام جس کو پُورا کرنے کے لئے کئی سال لگے غلاموں کی تجارت کا انسداد تھا۔ ملک امریکہ کے بعض حصّوں کی قومیں فاتحین کے ظلم و ستم کا نشانہ بن کر قریب صفحہ ہستی سے نابُود ہو رہی تھیں۔ اور ان کی جگہ کو

سے حبشیوں کو لایا گیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حبشی غلاموں کی باقاعدہ تجارت شروع ہوگئی تھی۔ ہمیں یہ امر ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہولناک تجارت اُن لوگوں نے جاری رکھی جو اپنے آپ کو مسیحی سمجھتے تھے۔ ان اقوام کے خلاف کوئی مؤثر احتجاج نہ کیا گیا۔ عوام یہ کہہ کر سب معاملے کو رفع دفع کر دیتے تھے کہ حبشی لوگ حام کی اولاد میں سے تھے۔ اور اُن پر جائز طور سے حام کی لعنت پڑی ہے۔ اُنہیں اپنے بھائیوں کے خادموں کے خادم بننا ہے۔ (پیدائش ۹: ۲۵)

اِس قسم کا استدلال اس نوعیت کے دعویٰ کے حق میں استعمال کرنا ان لوگوں کے لئے ایک چتونی ہے جو اپنے ذاتی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے کتاب مقدس کا اقتباس خداوند مسیح کی تعلیم سے پرکھے بغیر پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ حبشیوں کو ان کے اپنے بُت پرست وطن سے ایک مسیحی ملک میں لانا قرینِ مصلحت ہے۔ وُہ اس بات کا استفسار نہیں کرتے تھے کہ کیا ایک ملک مسیحی کہلایا جا سکتا ہے جہاں ایسے ایسے کام ہوتے ہیں۔ اس سے بہت قبل تاریک زمانوں میں کلیسیا نے یہ تعلیم دی تھی کہ عوام الناس کا فرضِ منصبی ہے کہ وُہ اپنی قوم اور وطن کے غلاموں کو رہا کریں۔ اب مسیحی مجددین کے ایک گروہ نے اس بات پر زور دیا کہ کسی بھی شخص کو غلام بنانا بدکاری ہے۔ بالآخر بہت سی دلیل بازی، بہت سی بشارت اور بہت سے عملی کام کے بعد ۱۸۰۸ء میں انگریزوں کی غلاموں کی تجارت کا انسداد کیا گیا۔ بعد ازاں ۱۸۳۳ء میں انگریزی رعایا کو غلام رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ قدم نوآبادکاریوں کے حق میں ایک ضربِ شدیدہ تھی کیونکہ ان کی تجارت غلاموں کی محنت پر مبنی تھی۔ پارلیمنٹ نے ایک کثیر رقم بوسیلہ ووٹ پاس کی تاکہ

اسی رقم سے ان لوگوں کے نقصان کو پورا کیا جا سکے۔ دیگر اقوام نے آہستہ آہستہ اس مثال کی پیروی کی اور زمانۂ حال میں کوئی ملک بھی غلامی کی اجازت نہیں دیتا۔

مسیحیّت اور انسانی فلاح وبہبود

(CHRISTIANITY & HUMANISM)

نسل انسانی کی امداد کے لئے یہ تحریکات بعض اوقات ایک کلیسیا یا مذہبی جماعت سے پیدا ہوئیں۔ بعض اوقات یہ کام محض نیکی اور امداد کی غرض سے کئے جاتے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ عوام نے یہ کہنا شروع کیا کہ نیکی وشفقت کے کاموں کا دارومدار کسی مذہبی عقیدہ پر مبنی نہیں ہونا چاہیئے جو خُدا کے کردار اور خُداوند مسیح کی فطرت سے متعلق ہو۔ نیز کہ تمام مذہب ایک ہی طرح خُدا تک پہنچاتے ہیں، کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم کیا اعتقاد رکھتے ہیں جب تک کہ ہم نیک زندگی بسر کرتے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی سے عوام میں سوچ بچار کا یہ طریق بہت زیادہ بڑھ چکا ہے۔ ان باتوں کے جواب میں دو چیزوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اگرچہ غیر مسیحیوں نے بہت سے نیک کام بڑی قوت اور عقیدت سے کئے ہیں لیکن نیکی کا پہلا تصور مسیح کی تعلیم سے پیدا ہوتا ہے۔ خُداوند مسیح نے بنی نوع انسان کو تعلیم دی کہ وہ رُوحِ انسانی کی بے حساب قدروقیمت کو جانیں۔ کیونکہ وہ مانتا تھا کہ اس نے عام جہان کے لئے جان دی ہے اور اُسی نے اپنے نمونہ سے انسانوں کو سکھایا کہ گناہگاروں کے دوست بنیں۔ زندگی میں دُکھ اور بدی کی چند صورتیں ہیں جن کا بظاہر کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا ماسوائے اُن لوگوں

کے جو تجسم اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ بعض آزمائشیں بڑی زبردست ہیں اور بعض دُکھ لا علاج ہیں۔ ان کی کوئی دوا ہی نہیں۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ فرض کیا کہ ہم تمام دُکھوں اور بدکرداریوں کا انسداد کر دیں اور ہر ذی رُوح کے لئے زندگی بسر کرنا آسان کر دیں اور ہر شخص کو ایسے حالات میں ڈال دیں جو اس کی فطرت کے عین موافق ہو، تو ہم ان اقدام سے۔ اگر ہماری دوڑ یہیں تک ہے، اُن لوگوں کو وُہ چیز نہیں دے سکتے جس کے وُہ محتاج ہیں "زندگی کا ماحصل خُدا کو جاننا ہے اور ہمیشہ تک اُس کی ذاتِ اقدس سے خوش رہنا چاہیئے" چُونکہ خُدا ہمیں یسُوع مسیح میں اپنا مکاشفہ بخشتا ہے لہٰذا ہمارے لئے زندگی میں بہترین شے یہ ہے کہ ہم اس مکاشفہ کو دیکھیں اور اسکو تھامیں نیز اسکے علاوہ ہر شے اس حد تک مفید ہے کہ ہمیں اس مکاشفہ تک پہنچائے۔

"شام کو میں مجبوراً ایلڈر اسٹریٹ کی ایک سوسائٹی میں گیا جہاں ایک شخص لُوتھر کا پیش لفظ پڑھ رہا تھا جو اُس نے رُومیوں کے خط کے لئے لکھا تھا۔ ۹ بجے سے پندرہ منٹ پہلے جب وُہ اُس تبدیلی کا بیان کر رہا تھا جو خُدا انسانی دل میں مسیح پر ایمان لانے سے پیدا کرتا ہے، تو مَیں نے محسُوس کیا کہ میرا دل عجیب طریق سے گرمایا۔ مَیں نے محسُوس کیا کہ میرا مسیح پر ایمان تھا، واحد مسیح پر، نجات کے لئے اور مجھے یقین دلایا گیا کہ مسیح میرے گناہ اُٹھا لے گیا ہے اور اُس نے مجھے بھی گناہ اور موت کے گناہ سے بچا لیا ہے۔"

(ویسلی کا جرنل۔ المورخہ ۲۴ مئی ۱۷۳۸ء)

ستر ھواں باب

علمِ طبّعیات اور کتابِ مقدّس کا سائنٹفک مطالعہ

انیسویں ۱۹ اور بیسویں ۲۰ صدیاں دونوں بے شمار تحریکات کا دَور ہیں۔ یہ تحریکات بظاہر ایک دُوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں تاہم ان میں باہمی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہر ایک تحریک میں سائنٹفک دریافت (SCIENTIFIC DISCOVERY) کی خصوصیت پائی جاتی ہے یعنی ان میں علمی اصُول کے مطابق دریافت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ یہ تحریکیں کسی قدر، جوش و ولولہ بھری ہیں کہ ہم سچائی کو معلوم کریں اور درست حقائق کو حاصل کریں اور ان نظریات کو قبوُل نہ کریں جو سچائی پر مبنی نہیں۔

عِلمِ طبّعیات:-

اس دَور میں علمِ طبّعیات کو حاصل کرنے میں بڑی بھاری ترقی ہُوئی۔ علمِ کیمیا، برقیات، پرزوں کی ترتیب و ترکیب، حیاتیات، علمِ طب کی دریافتوں نے دُنیا اور انسان کی تاریخ کے متعلق نئی روشنی ڈالی۔ ان چیزوں نے انسانوں کے لئے لاتعداد مواقع پیدا کئے ہیں کہ وہ اپنے حالاتِ زندگی کو اپنی طبعیت کے مطابق ڈھالیں۔ اس قسم کے کام کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

مسئلہ ارتقا EVOLUTION :-

انیسویں صدی کے بڑے بڑے سائنسدانوں میں سے ایک چارلس ڈارون ہے اُس نے سب سائنسدانوں سے بڑھ کر یہ تعلیم دی کہ وہ مسئلہ ارتقا پر ایمان لائیں۔ اس کے وقت تک عوام اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ دُنیا نباتات وحیوانات اور نسلِ انسانی کے ساتھ جیسا کہ ہم اُسے دیکھتے ہیں حکم الٰہی سے ایک ہی وقت پر پیدا کی گئی ہے۔ ڈارون کی تعلیم کے مطابق دُنیا نے کئی ارتقا کی منازل طے کی ہیں اور یوں زندگی ایک اٹل قانون کے مطابق بلند ترین اشکال اختیار کرتی گئی ہے۔ عوام الناس نے یہ تصوّر کر رکھا تھا کہ خُدا نے اپنی قوّت کو معجزات کے وسیلے ظاہر کیا تھا۔ اُس نے ایسے کام کئے تھے جو قوانینِ فطرت کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ اب ان کو یہ معلوم ہُوا ہے کہ خُدا کا اپنے قوانین کے خلاف چلنا نفرت انگیز ہے۔ کتاب مقدس کی اعجازی کہانیاں ان مفکرین کی نگاہ میں یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ بات درست نہ تھی اور بہت سے لوگ اس وجہ سے مسیحیت پر ایمان لانے سے ہٹ گئے لیکن دیگر لوگوں نے مزید تحقیقات شروع کر دی۔

مذہب کا سائنٹیفک مطالعہ

SCIENTIFIC STUDY OF RELIGION)

مذہب بھی دیگر اشیا کی طرح اصولِ مطالعہ کا موضوع بن گیا۔ رُومی حکومت کی تبدیلی کے بعد پہلی مرتبہ یہ سوال علانیہ اُٹھایا گیا کہ کیا مسیحی خدمت سچی ہے؟ کیا مسیحی مذہب کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہے؟ کیا ہر ایک مذہب سچا ہے ؟

مذہب اپنے متعلق کیا روشنی ڈال سکتا ہے؛ کیا مسیحیت کی کہانی محض ایک روایت ہے یا یہ قدیم رسومات کا ایک مجموعہ ہے؟ کیا یہ محض مذہبی پیشواؤں کی اختراع ہے۔ اور اُن کی دلچسپی یہ تھی کہ ایک جاہل طبقہ کو اپنی گرفت میں رکھیں؟ کیا یہ ایک فرضی چیز ہے یا یہ بھی مصر، ہندوستان، چین یا یونان کی قدیم داستانوں کی طرح ایک داستان ہے؟ عوام کو تو اریخ کتبِ مقدسہ کے متعلق بہت کم علم تھا کہ کس طرح مختلف کُتب ضابطہ تحریر میں آئیں یا کس نے انہیں لکھا اور اس کا کتنا کثیر حصہ اُن کے خیال کے مطابق اس امتحان میں پورا نہیں اترا۔ مسیحی کلیسیاؤں نے پہلے پہل کبھی بھی یہ محسوس نہ کیا کہ ان سوالات کا جو اُن سے پوچھے جاتے ہیں کیا مفہوم ہے۔ وہ جذبہ بیداری کے زیرِ اثر آگے کی طرف بڑھ رہی تھیں جن کا تذکرہ ہم نے پچھلے باب میں کیا ہے اور اُن کی توجہ زیادہ تر اس طرف تھی کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے بخلاف اس کے کہ انہیں کیا سوچنا چاہیئے۔

یہ تمام سوالات جو ان کے ایمان کی ابتدائی باتوں سے متعلق تھے ایسے موقع پر کئے گئے جبکہ وہ سرتاپا اس ایمان کو عملی جامہ پہنانے میں مستغرق تھے اور یہ گویا دشمن کی طرف سے ایک اچانک حملہ تھا۔

کتابِ مقدس کا سائنٹفک مطالعہ

(SCIENTIFIC STUDY OF THE BIBLE)

تاہم پہلے اس امر کا امکان تھا کہ کتابِ مقدس کے سائنٹفک مطالعہ کو مخاصمانہ رنگ میں دیکھا جائے بلکہ اسے ایک معقول اعتراض گردانا جائے اور اسے ایک اعتراض سمجھا جائے جو سچائی کی بنا پر کیا گیا ہے۔ کتابِ مقدس کا سائنٹفک مطالعہ کسی حملے کے جواب میں شروع نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ کئی سال

قبل شروع ہوا تھا۔ سترہویں صدی کے اختتام پر ۱۶۷۸ء میں ایک فرانسیسی رومن کیتھولک پریسٹ رچرڈ سائمن (RICHARD SIMON) پر یہ بات روشن ہوئی کہ پیدائش کی کتاب کئی کہانیوں میں ایک واقعہ کی دو کہانیاں پیش کرتی ہے مثلاً طوفان کی کہانی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دریافت سے عوام میں زیادہ مذاق پیدا نہیں ہوا۔ ستر سال سے زائد عرصہ کے بعد ایک فرانسیسی بنام جین آسترک نے جو کہ ایک رومن کیتھولک تھا، اس بات پر غور کیا کہ پیدائش کی کتاب میں خدا کے لئے دو نام استعمال کئے گئے ہیں۔ پہلا لفظ وہ ہے جس کا ترجمہ ہم خدا کرتے ہیں۔ اور دُوسرا لفظ وہ ہے جس کا ترجمہ ہم خداوند کرتے ہیں۔ یہ لفظ اکٹھے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ تمام کہانی میں بعض اوقات ایک دُوسرا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ آسترک کو ایسا معلوم ہوا کہ اس حقیقت کے پیچھے کوئی اہم بات ہے چہ جائیکہ وہ اس اہمیت کو افشاں نہ کر سکا۔ اس کے نظریہ کے مطابق دیگر لوگوں نے اس کے مشاہدے پر غور کیا جس کے نتائج بے حد اہم ثابت ہوئے۔ اُس وقت سے علمیت کا ایک جدید دَور شروع ہوا۔ نہ صرف علما و فضلا کے اذہان بلکہ عام کتاب مقدس کے پڑھنے والوں کے اذہان بھی جدید طریق مشاہدہ میں زیادہ تربیت یافتہ ہیں۔ اُنہوں نے تازہ نقاط کو معلوم کیا۔ انہوں نے ان مشکلات پر بحث و مباحثہ کیا جنہیں پہلے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اُنہوں نے بے شمار سوالات پُوچھے۔

متن یا الفاظ کی تنقید

یہ سوالات اُنہیں متن کی صحت کی طرف واپس لے آئے۔ متن کے تحفظ کا کام ایک دفعہ اوریجن (ORIGEN) کو درپیش تھا۔ بڑے بڑے جلیل القدر اور

جدید عُلما نے اس کام کو بڑی کامیابی سے کیا اور اب ہم یقین کامل سے کہہ سکتے ہیں کہ اصل کُتب کے اصلی الفاظ زیادہ محفوظ ہو چکے ہیں۔ عہد جدید کے متعلق ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ عہد قدیم کے عام مفہوم اور متن کے الفاظ کے متعلق ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں، کہ جیسے وُہ خُداوند کے وقت میں تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔

ہمارے پاس وُہی عہد قدیم ہے جو خُداوند کے پاس تھا۔ علاوہ ازیں اس دَور کے وسیلے ہمیں بڑی غیر متوقع اور نمایاں طریق سے اور قدیم یادگاروں کی دریافت سے مدد ملی ہے۔ ان دریافتوں کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ان قدیم رسم الخط کی تحریرات کو پڑھا جا سکے جو مصر اور میسوپوتامیہ میں مروّج تھیں اس سے پہلے ہم ان تحریرات کے مفہوم سے نا آشنا تھے۔

THE ROSETTA STONE.

اُنیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں ایک پتھر لایا گیا جس پر تصویری خط میں ایک کتبہ تھا جو فرعونوں کے ایام میں مصر کے پرستش استعمال میں لاتے تھے۔ اس کتبے کے نیچے ایک اور کتبہ یونانی حروف میں قلمبند تھا۔ عُلما کا قیاس تھا کہ یونانی کتبہ مصری لکھنے کا ایک ترجمہ ہے اور جو نام یونانی میں لکھے ہیں وُہی مصری زبان میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔ بعض یونانی الفاظ کے گرداگرد ایک لکیر کھینچی تھی اور عُلما کا قیاس تھا کہ لکھے ہوئے نام مصری بادشاہوں کے نام ہیں۔ اِن قیاسات نے مزید قیاس آرائی کا جذبہ پھونک دیا۔ یہ قیاسات بالکل درست نکلے اور یونانی تحریر کی مدد سے جس پر اُنہیں دسترس تھی، اُنہوں نے مصری تحریر کا عُقدہ حل کیا۔ چنانچہ اب وُہ مصری کتبے کو بآسانی پڑھ سکتے ہیں اور تمام قدیم کتب اور کتبوں کو جو مصر

سے ملی ہیں سمجھ سکتے ہیں۔

مٹی کی تختیاں (CLAY TABLETS)

چند سالوں کے بعد آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے اسور اور بابل کے مدفون شہروں کی کھدائی شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہیں بے شمار مٹی کی تختیاں ملیں جن پر لکھا ہوا تھا۔ قدیم زمانوں کے اُن ممالک کے باشندے جب کچھ لکھنا چاہتے تھے تو وہ نرم گُندھی ہوئی مٹی اور بانس یا دھات کا ایک اوزار لیتے اور اُس اوزار کو مٹی پر دبانے سے حروف بناتے۔ بعد ازاں اس مٹی کو آگ پر پکایا جاتا تھا جس سے وہ پتھر کی طرح ایک سخت اور پائیدار تختی بن جاتی۔ ان تختیوں میں سے بعض ایسی تختیاں ملیں جن پر پیدائش اور طوفان کی کہانیاں لکھی ہوئی تھیں جن کا طرزِ بیان پیدائش کی کتاب کی کہانیاں سے بہت زیادہ ملتا جلتا تھا۔ ان کہانیوں کا خاکہ ایک جیسا ہے لیکن عبرانی کہانی میں ایک رُوحانی پیغام ہے جو دُوسری کہانی میں نظر نہیں آتا۔ یہ کہانیاں اِس بات کا ثبوت ہے کہ عبرانی لوگ کس قدر اپنے ہمسایوں کی طرح تھے تاہم وہ ان سے فرق تھے۔

تل اُلامرنہ کی تختیاں (TEL-E-AMARNA TABLETS)

ان تختیوں کا ایک بڑا دلچسپ مجموعہ اسور سے نہیں بلکہ مصر سے حاصل ہُوا۔ یہ تختیاں وُہ مکتوب نکلے جو سلطنت کے مختلف صوبوں کے صوبیداروں کی طرف سے ایک فرعون کو تحریر کئے گئے تھے۔ اس سلطنت میں یروشلم اور دیگر بڑے بڑے شہر شامل تھے۔ ان مکتوبات میں صوبیدار اپنی اپنی تشویش و تکلیف کا بیان کرتے ہیں جس میں وُہ مبتلا تھے۔ اُن کی یہ حالت تند خو قبائل کے حملوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی جو حبیری کے نام سے موسوم ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبائل

عبرانی لوگ تھے جو کنعان کی سرزمین کی طرف دباؤ ڈالتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

حمورابی کا مجموعہ قوانین:-

ایک سیاہ پتھر پایا جو چھ فٹ لمبا ہے کچھ کندہ کاری ہے۔ یہ ایک بادشاہ کی تصویر پیش کرتی ہے جو ہاتھ جوڑ کر اپنے دیوتا کے سامنے کھڑا ہے، اور اُس سے ایک قانون یا ضابطہ حاصل کر رہا ہے۔ یہ قانون پتھر پر کھدا ہوا ہے۔ بہت سی باتوں میں یہ قانون معاہدوں کی کتاب یاد دلاتا ہے (ملاحظہ ہو۔ خروج ابواب ۲۰: ۲۲ سے ۲۳ تک)۔ یہ پتھر اتنا قدیم ہے کہ اس کا تعلق ابراہام کے زمانہ سے ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وُہ بادشاہ جس کی تصویر اس پتھر پر کھدی ہے امرافیل (AMRAPHEL) شہنشاہ شینار ہے جس کا تذکرہ پیدائش ۱۴: ۱ میں مندرج ہے۔ یہ قوانین اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ وُہ ملک کس قسم کا تھا جب ابراہام نے اُسے چھوڑا اور کنعان کو چلا گیا۔

ایثار حادون کا مینار:-

(OBELISK OF ESAR HADDON)

وُہ جنگیں جو اسوری اور بابلی لوگوں سے ہوئیں اور جن کا بیان ہم سلاطین کی کتابوں میں پڑھتے ہیں تختیوں یا میناروں پر بیان کی گئی ہیں۔ ایک پتھر کا ایک مینار ملا ہے جس پر قاصدوں کی تصویریں کھدی ہیں جو محکوم اقوام سے شاہ اسور کے پاس خراجِ عقیدت لا رہے ہیں۔ ان قاصدوں میں سے بعض قاصد سرزمین امور

یعنی اسرائیل کے تحائف لا رہے ہیں۔ایک تختی پر یروشلم کے محاصرے کے متعلق سینخرب (SENNACHERIB) کی رُوئداد لکھی ہے جو ہم ۲ سلاطین ۱۸: ۱۹ اور یسعیاہ ۳۶: ۳۷ میں پڑھتے ہیں۔ وُہ بتاتا ہے کہ اس نے یروشلیم سے بڑی بھاری رقم حاصل کی اور اُس نے "حزقیاہ شاہ یہوداہ کو ایک پرندے کی طرح ایک پنجرے میں بند کیا"۔ لیکن وُہ یہ نہیں کہتا کہ اُس نے شہر کو قبضہ میں لیا۔ وُہ مختلف طریقوں سے اسے بیان کرتا ہے۔

پیپرس :-

ملک مصر سے کتابوں کے کھُلے ہُوئے اوراق ملے ہیں جو ایک قسم کے کاغذ پر جسے پیپرس کہتے ہیں قلمبند ہیں۔کاغذ کے ان ٹکڑوں کو پیپرائی (PAPYRI) کہتے ہیں۔ ان میں سے متعدد کاغذات پہلی مسیحی صدیوں کے ہیں بعض میں خداوند المسیح کے اقوال لکھے ہیں، جن کے متعلق ہمیں اناجیل کے ذریعہ علم ہے۔ بعض اقوال سے ہم آشنا نہیں اور ہم یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ اقوال فی الحقیقت ربنا المسیح کے اقوال ہیں۔ چونکہ پیپرس کے یہ کاغذات فوراً ٹوٹ جاتے ہیں اس لئے عام طور پر ان کاغذات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹکڑا جو ۱۹۳۶ء میں ہاتھ لگا، مقدس یوحنا کی انجیل مقدس کے نسخہ سے ہے جو دُوسری صدی میں قلمبند ہُوا تھا۔ یہ ٹکڑا موجودہ مسیحی تحریرات میں سب سے قدیم چیز ہے۔

نُسخہ سینائی (CODEX SINAITICUS)

کتابِ مقدس کے قدیم ترین نسخے جو ہمارے پاس موجود ہیں چوتھی صدی

ہیں لکھے گئے تھے۔ بہت سی بائبلیں، ڈائیوکلیشن اینڈ بیت (DIOCLETIAN PERSECUTION) میں ملاحظہ ہو۔ باب چہارم) میں فنا کردی گئی تھیں، اور سلطنت کی مذہبی تبدیلی کے بعد یہ ضروری تھا کہ ان کی جگہ نئے نسخے تیار کئے جاتے۔ اس دور میں ایک خوبصورت نسخہ تیار کیا گیا تھا جو اب ویٹکن کتب خانہ میں رکھا ہے اور اسے نسخۂ ویٹکن (VATICANS) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اُسی وقت یا کچھ عرصہ کے بعد ایک اور نسخہ تیار کیا گیا تھا جس کی کہانی بڑی عجیب و غریب ہے۔ یہ نسخہ فی الحقیقت اُس وقت کے کسی بہترین خوش نویس کے ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ اس کی تحریر بے حد خوبصورت رسم الخط میں چھاپے کے حروف کی طرح بہترین چرمی کاغذ پر قلمبند کی گئی ہے۔ ہم ۱۸۴۴ء تک اس کی تاریخ سے نا آشنا تھے جبکہ ایک جرمن سیاح بنام ٹشنڈورف (TISCHENDORF) سینٹ کیتھرین کے قدیم راہب خانہ، جو کوہِ سینا پر آباد تھا گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہاں بے شمار قیمتی کتابیں پڑی ہیں۔ ایک روز وہاں کے راہبوں میں سے اُسے راہب خانہ کی گزرگاہ میں ایک راہب ملا جو پرانے کوڑ کباڑ کو ایک ٹوکری میں ڈال کر آگ جلانے کی غرض سے بیمار رہا تھا۔ سیاح مذکورہ نے راہب سے سلسلۂ گفتگو جاری کر دیا اور اس اثنا میں اُسے معلوم ہوا کہ اس کوڑ کباڑ میں کچھ چرمی کاغذ کے اوراق ہیں جن پہ بڑی خوبصورت یونانی تحریر بھری پڑی ہے۔ اُس نے قریب ہو کر غور سے ان اوراق کا مشاہدہ کیا اور انجیل تمثیل کے آدمی کی طرح جس کا تذکرہ متی ۱۳: ۴۴ میں مرقوم ہے، اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے ایک خزانہ ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ اوراق کتاب مقدس کی ایک جلد کے چالیس صفحات تھے۔ کئی سالوں کے بعد وہ اس نسخے کے دیگر اوراق حاصل کرنے

میں کامیاب ثابت ہوا۔ اس مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اُس نے یہ نسخہ زارِ رُوس (TSAR OF RUSSIA) کو مرحمت کیا اور یُوں ساٹھ سال سے زائد عرصہ تک یہ نُسخہ زار کے کُتب خانہ میں بمقام سینٹ پیٹرس برگ (جسے اب لینن گراڈ کہتے ہیں) پڑا رہا۔ جنگ عظیم میں زار کو شکست ہوئی اور یوں اس کا کُتب خانہ سوویٹ کے ہاتھوں میں آگیا۔ کئی سالوں تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ کتابِ مقدّس کے اس نسخے کا کیا انجام ہُوا۔ (یہ نُسخہ نسخۂ سینائی کے نام سے موسوم ہے کیونکہ یہ کوہِ سینا سے دستیاب ہُوا تھا) لوگوں کو تشویش تھی کہ شاید یہ نسخہ برباد ہو چکا ہے۔ لیکن جُملہ عُلماء فضلا اور کتابِ مقدّس کے پروانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ۱۹۳۴ء میں سوویٹ حکومت نے برٹش میوزیم لندن کے ڈائرکٹروں کو لکھا اور اُنہیں یہ نُسخہ بیچنے کی پیش کش کی۔ سلطنتِ برطانیہ نے اس کو خریدنے کے لئے نصف قیمت دی اور عوام النّاس نے بقیہ قیمت ادا کی اور اب یہ نسخہ برٹش میوزیم کی سب سے قیمتی اشیاء میں سے ایک ہے۔

"وہ جو متحیر ہے حکومت کرے گا اور وہ جو حکومت کریگا آرام پائے گا۔ تم متحیر و حیرانگی سے اس چیز کو دیکھو جو تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔" (یہ قول ہمارے خداوند المسیح سے منسوب ہے اور ایک پپیری سے اخذ کیا گیا ہے)۔

اٹھارواں باب

اُنیسویں اور بیسویں صدیوں کی تحریکیں!

مشنیں :-

مغرب میں ان صدیوں کے دوران میں تمام کلیسیاؤں کے اندر شخصی مذہب کی بیداری وسیع اور گہرے طور سے پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ مشنری ذمہ داری کا احساس بھی ہوا۔ اس سے قبل کے کسی بھی دور میں کلیسیا زیادہ وسیع طور سے نہ ہی پھیلی تھی اور نہ ہی اس نے سُرعت سے کام کیا تھا۔ اب دُنیا عالم میں کوئی بھی مُلک نہیں رہا تھا جہاں تھوڑی بہت انجیل کی منادی نہیں کی گئی تھی۔ دُوسرے لوگوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے گہرے اثرات ان کلیسیاؤں پر بھی پڑے جنھوں نے اس سرگرمی کی ابتدا کی تھی۔

مذہب اور سائنس :-

ان قدیم کلیسیاؤں نے، اپنی دوہری کوشش میں کہ مسیحی ایمان کی منادی نئے ممالک میں اور اپنے اپنے ملک میں کریں جدید سائنس اور جدید معلومات کی ٹکر کو محسوس کیا۔

اُنیسویں صدی کے وسط میں جدید غور و فکر نے جس کے متعلق ہم گزشتہ باب میں غور کر رہے تھے، مختلف ممالک میں تعلیم یافتہ طبقوں کو اپنا گرویدہ بنایا۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ وہ کسی بھی صورت میں کتاب مقدس کے الہام پر ایمان نہیں لا سکتے اور مسیحیت باطل ثابت کر دی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے خود بخود مسیحیت کو ترک کر دیا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش اس نظریہ سے کی کہ وہ اسے ایک قدیم اوہام پرستی متصور کریں جس کی اب مزید ضرورت نہیں رہی۔ اس نوعیت کی سوچ بچار بہت جلدی کم تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی پھیل گئی اور موجودہ وقت میں پچاس سال پہلے سے عوام میں بہت کم ایمان رہ گیا ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنا ہے کہ دراصل اب بہت کم لوگ اسے بلا ثبوت مانتے ہیں۔ اگر معتقدین کا شمار کم ہے تو ان کا ایمان اس قدر زیادہ سوچ سمجھ سے تھاما ہوا ہے کہ اگلے بیس سالوں میں یہ بات ظاہر ہو جائیگی کہ مسیحی ایمان معدوم نہیں ہوا بلکہ نکھر گیا ہے، اور اس کی تادیب ہوئی ہے۔

ہر سال مسیحی عقیدہ اور زندگی کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کتب ہمیں اس منزل کا رستہ دکھاتی ہیں جس طرف مذہبی قوتِ خیال گامزن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنفین اس بات میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں کہ دوبارہ زمانہ حال کی زبان میں قدیم مسیحی ایمان کے مدعی بنیں اور جدید معلومات کی روشنی میں اس دعوٰی کی تصدیق کریں۔

ہمارے عبرانی اور یونانی علم کی ترقی کے پیش نظر کتاب مقدس کی ترجمانی کا کام تازہ دم قوت سے دوبارہ شروع کیا گیا ہے۔ قدیم تراجم کی نظر ثانی کی گئی ہے اور بہت سے نئے نئے ترجمے کئے جا چکے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے آخر میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے ایسے سات سو چھ ترجمے کئے تھے۔

اتحادِ مذہب: اینگلیکن

شخصی مذہبی بیداری کے بعد عمومی مذہب کے احساس کی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ یہ چیز اینگلیکن شراکت کے روپ میں ظاہر ہوتی اور آکسفورڈ تحریک (OXFORD MOVEMENT) کے نام سے موسوم ہے۔ اس تحریک نے اینگلیکن شرکا کو سیکرامنٹوں کی وقعت واحترام کے لئے اور کلیسیا کے ظاہری اتحاد کے لئے جو بہت زیادہ ختم ہو چکا تھا، متوجہ کیا ہے۔

رُوم:-

کلیسیائے رُوم نے ہم آہنگ نہ ہونے والی کلیسیاؤں سے مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ انہوں نے اس کام کو ہتھیاروں سے مسلح ہو کر نہیں بلکہ بڑی احتیاط کے ساتھ جانچی تولی ہوئی درخواستوں اور انواع واقسام کی دلائل پر مبنی قرار دیا ہے۔ یہ کلیسیا ابھی تک اس حق کی مدعی ہے (جس حد تک دیگر کلیسیائیں اس امر کا جائزہ لے سکتی ہیں) کہ کلیسیا رُوم نے یہ حق نہ خداوند مسیح سے نہ مقدس پطرس سے بلکہ رُوم کے شاہی فرمانرواؤں سے حاصل کیا ہے کہ کلیسیائی اتحاد کلیسیائے رُوم کی اطاعت کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ کلیسیائے رُوم نے اپنی اعلیٰ حیثیت کو ۱۸۷۰ء میں پوپ کی معصومیت (INFALLIBILITY OF THE POPE) کے اعلان سے ظاہر کیا ہے۔ کلیسیا نے اس دعویٰ کے تحفظ کے لئے اطالیہ کی بچی کھچی قدیم پوپی جاگیروں کو قبضہ میں رکھنے کے حق پر زور دیا ہے جو مرورِ زمانہ کے ساتھ کھو چکا تھا۔ ان جاگیروں کا قبضہ پوپ کو ایک حاکم الوقت راجہ کی حیثیت دیتا ہے جو کسی

دُنیوی حکومت کے ماتحت نہیں ہے۔ پوپ کو یہ حیثیت ۱۹۲۹ء میں واپس کر دی گئی تھی جبکہ اطالیہ کے بادشاہ نے اسے ایک چھوٹی سی ریاست کا فرمانروا تسلیم کرلیا۔ یہ ریاست صرف ویٹیکن پیلس (VETICAN PALACE) باغات اور رُوما شہر کے پانچ بڑے بڑے گرجوں کے حقوق پر مشتمل ہے۔

مشرقی اور ایشیائی کلیسیائیں :-

مشرق وسطیٰ کی کلیساؤں اور ایشیائی کلیساؤں کا بچا کھچا حصہ بہت دیر سے منقطع ہو چکا تھا اب وہ اس قابل نہ تھا کہ باقی دُنیائے مسیحیت کے ساتھ مل کر ایک مجموعی قدم اُٹھائے لیکن اب وہ حصہ سیاسی حالات کے زیرِ اثر دُنیائے مسیحیت کی طرف کھینچا گیا ہے۔ جدید ایجادات نے مختلف ممالک کے مابین آمدورفت کے سلسلہ کو پہلے سے بہت زیادہ آسان کر دیا ہے۔

یونان اور رُومی کلیسیائیں :-

یونانی اور رُومی کلیسیائیوں کے مابین فرقہ بندی کے زخم جو ۱۰۵۴ء میں پیدا ہوتے تھے ابھی تک ہرے نہیں ہوئے تھے۔ بعض حالات میں اُن کے مابین شرکت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ یونانی کلیسیا اپنی قدیم روایات کی پُرجوش عقیدت کے باعث اجن پر وہ چوتھی صدی سے عمل درآمد ہے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کلیسیائی عبادتی تبدیلی سے اتنی خائف تھی کہ وہ بے حسی اور سستی کی حالت میں غرق ہو چکی تھی ۱۴۵۳ء سے قسطنطنیہ کا اُسقفِ اعظم اپنے تقرر شدہ خدام کے ساتھ دنیوی کاروبار میں ترکستان کے سلطان کا محکوم ہے۔ رُوسی کلیسیا کئی صدیوں سے زار یعنی رُومی شہنشاہ کی مکمل اطاعت سے متعلق

رہی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں جنگِ عظیم کے دوران میں زار کا زوال ہُوا اور کلیسیا پر اذیت کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ اس طوفان میں شہادت کا تاج اس کلیسیا کو واپس پہنایا گیا۔ اس کے شُرکا کو اور خاص طور پر پریسٹوں کو غربت، فاقہ کشی، قید بالجبر کام، اور سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کلیسیا کے متعدد گرجا پر قبضہ کیا گیا اور اُنھیں گداموں، عجائب گھروں یا دارالتصویر (سنیما) کے طور پر استعمال میں لایا گیا۔ اس جلا وطن کلیسیا نے "CHURCHIN EXILE" (جیسے کہ یہ کلیسیا اپنے آپ کو اس نام سے پکارتی ہے) اپنی ناکامیابی سے اقبال حاصل کیا ہے۔ اب وہ مستفعدی سے اپنی غلطی کی تصحیح کے درپے ہے اور اُس گھڑی کی منتظر ہے کہ اُسے کب واپس بلایا جائے کہ وہ ملکِ رُوس کو پہلے سے بہتر تعلیم دے اور اس کی خدمت کرے۔ رُوس میں رُوسی کلیسیا کے باقی ماندہ حِصّے اور دیگر فرقوں کے مشنری صاحبان خصوصاً بپٹسٹ لوگ شدید مشکلات اور آزمائشوں کا مقابلہ کرتے ہُوئے مسیحیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ یہ استقفی، کلیسیائیں ہیں (ماسوائے بپٹسٹ لوگوں کے) جن پر ان کے اپنے بشپ یا بشپوں کی مجالس حکمران ہیں۔ صرف رُومی کلیسیا کا نظم و نسق ایک بشپ کے ہاتھ میں ہے جو دیگر بشپوں سے ممتاز و اعلیٰ ہے۔

غیر استقفی کلیسیائیں (NON-EPISCOPAL CHURCHES)

غیر استقفی کلیسیاؤں کی امتیازی طرزِ حکومت یا تو پریسبٹیرین ہے، یا کانگریگیشنل ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اوّل الذکر نظام کا سلسلہ جان کیلون (JOHN COLVIN) تک چلا جاتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ الفاظ یعنی پریسبٹیر (PRESBYTER) (ایلڈر) اور بشپ (ناظر و نگران) جن کا ذکر

عہد جدید میں یہ جُدا جُدا عہدوں کے لئے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ یہ ایک ہی عہدے کی دو تعریفیں ہیں۔ کلیسیائی اتحاد کو کلیسیائی عدالتوں کے تدریجی نظام کے وسیلے بڑے احسن طریق سے ادا کیا گیا ہے کرک سیشن جو لوکل کانگریگیشن کے تقرر شدہ خدام اور بلا تقرر ایلڈروں پر مشتمل ہے اور پریسبیٹری کرک سیشن کے ان نمائندوں، تقرر شدہ خدام، بلا تقرر ایلڈروں پر مشتمل ہے جو اس کے حلقۂ انتظام میں داخل ہیں۔ سنڈ اپنے صوبوں کی پریسبیٹریوں کا مجموعہ ہے، ان کلیسیاؤں میں جو صوبائی حدود سے زائد حیثیت رکھتی ہیں جنرل سنڈ یا جنرل اسمبلی عدالت العالیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی نظام تھوڑے سے بہت تغیر و تبدل کے ساتھ یورپ میں کیلونسٹ یا ریفارمڈ کلیسیاؤں اور پریسبیٹرین نے اختیار کر رکھا ہے۔

میتھوڈسٹ کلیسیا نے پریسبیٹرین طرز کو اختیار کیا ہے۔ اس میں کلیسیائی عدالتوں کا ذیل کے طریق سے ایک ترتیب وار نظام ہے۔

سربراہوں کا اجلاس (LEADERS MEETING)

علاقائی سہ ماہی اجلاس (THE QUARTERLY MEETING OF THE CIRCUIT.

ضلعی سنڈ (DISTRICT SYNOD)

اور کانفرنس (CONFERENCE)

کانگریگیشنلسٹ اور بپٹسٹ کلیسیاؤں نے کانگریگیشنل یا خود مختار طریق اختیار کر رکھا ہے۔ ان میں مقامی کلیسیا ہر نوعیت کی عدالت العالیہ سے آزاد اور خود مختار ہے۔ گزشتہ سالوں میں کلیسیائی اتحاد کے حلقوں یا انجمنوں کو وجود میں لانے کے لئے اظہار خیال کیا گیا تھا۔ ان انجمنوں (UNIONS) کو نظم و نسق کا کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ وہ انفرادی نمائندوں پر مشتمل ہیں جو

باہمی امداد و رفاقت اور مشترکہ مفاد و مصلحت کی ترقی کے لئے ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں۔

لوتھرن فرقہ کے لوگ ایک جماعت کی تنظیم نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اُن ممالک کے مطابق منظّم کرتے ہیں جہاں جہاں وہ پائے جاتے ہیں۔ بعض جماعتوں کی تنظیم اُسقفی طرز کی ہے اور بعض کی غیر اُسقفی طرز کی۔ جرمنی میں بہت سے لوتھرن کلیسیا کے پاسبان ظلم و تشدّد کا شکار بنے ہوئے ہیں کیونکہ انہوں نے حکومت کو اجازت نہیں دی تھی کہ وہ کلیسیائی عقائد میں مخل ہوں۔ لہٰذا اس بنا پر متعدد لوتھرن پاسبانوں کو اُن کے کاموں اور خاندانوں سے علیحدہ کر کے کیمپوں میں مقید کر دیا گیا ہے۔ جہاں اُن سے جبراً کام کرایا جاتا ہے۔ دی سوسائٹی آف فرینڈز[۱] جنہیں عام طور پر کویکرز[۲] کہا جاتا ہے مذکورہ بالا کلیسیاؤں سے اس رنگ میں متفرق ہیں یعنی ان کے ہاں نہ تو سیکرامنٹوں کی رسوم ہیں اور نہ ہی مقرر شدہ خدمت پائی جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جنگ و جدل ہر حالت میں غلط ہے۔ مکتی فوج کے لوگوں کے ہاں بھی سیکرامنٹوں کی رسوم نہیں ہیں اور اس کا نظامِ حکومت ایک فوجی طرز پر ایک جنرل کی زیرِ نگرانی ہے۔

ہم نے اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ کس طرح بیس[۲۰] صدیوں کے دوران میں کلیسیا نے ان تین کاموں کو جو پہلے پہل اس کی تفویض میں کئے گئے تھے پورا کرنے کی کوشش کی یعنی سیکھنا، سکھانا اور گواہی دینا۔ پہلے دو کام کسی قدر مختلف کلیسیاؤں کے وسیلے جن کا ہم نے ابھی ابھی تذکرہ کیا ہے سرانجام دئے جا سکتے ہیں لیکن تیسرا کام نہیں کیا جا سکتا۔ ایک منقسم کلیسیا کبھی بھی ایک متحدہ گواہی نہیں دے سکتی اور ایک منقسم گواہی سے یقینِ کلی پیدا نہیں ہو

سکتا۔ اب ہم کلام پاک کی چوتھی آیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ہم اس خیال کو ذہن نشین کریں کہ اگر کلیسیا منقسم حالت میں ہے تو خداوند یسوع مسیح غیر منقسم ہے اور وہ دنیا کے آخر تک ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔ بیسویں صدی کی سب سے اُمید افزا تحریک ان منقطع کلیسیاؤں کا ایک دوسرے کے قریب قریب ہونا ہے۔ اس بات کی کوشش کی جا چکی ہے کہ سب سے پہلے کلیسیائی جدائیوں کو دور کیا جائے۔ رہنماؤں اور مفکروں نے دلائل کی بنا پر کسی خاص طریق کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے یا انہوں نے کسی خاص اصول کو بنانے کی کوشش کی ہے جس سے اختلافی مقاصد و آراء میں موافقت پیدا کی جائے۔ لیکن ابھی تک ان کے ہاتھ اس قسم کا اصول نہیں لگا۔ بیسویں صدی کی اتحادی تحریکیں مجموعی کوشش اور مجموعی زندگی کے اعتراف اور قدرشناسی سے پیدا ہوئی ہیں۔

علم و ہنر کی تحصیل کا باب سب کے لئے کھلا ہے۔ جنگ و جدل کا بوجھ اور مشکلات فرقہ وارانہ اختلافات کو ختم کر دیتی ہیں۔ سب مسیحی فرقوں کی زبردست کوشش ہے کہ دنیا ئے عالم کے بشارت کے کام کو مکمل کیا جائے۔ یہ چیز ان فرقوں کے اندرونی اتحاد کو ظاہر کرتی ہے۔

ہم سب اقبال کرتے ہیں کہ خداوند مسیح ہمارے ساتھ ہے اور ہم دوسروں کے ساتھ کھڑے ہو کر اُس کا دیدار کرتے ہیں۔ زندگی کے موجودہ اوقات تاریک ہو سکتے ہیں لیکن ہم خوفزدہ نہیں ہوتے۔ اس سے قبل ہم نے مشکلات کے اوقات دیکھے ہیں اور ہر ایک وقفہ میں ہم نے اس بات کو معلوم کیا ہے کہ وہ جا آخر تک برداشت کرتے رہے ہیں بچ نکلے۔

ربنا المسیح نے کبھی بھی یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ اُس کے شاگردوں کے لئے زندگی بسر کرنا آسان ہوگا۔ خداوند نے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ وہ زندگی بسر کرنے

کے قابل ہوگی - چنانچہ یہ زندگی ایسی ہی ہے - تمام ناکامیابیوں، تمام غلطیوں اور تمام تقسیمات کے باوجود کلیسیا کے عالمگیر فتح نہیں کی جا سکتی، یہاں تک کہ بدترین اوقات میں بھی جبکہ خود کلیسیا پورے طور سے گر چکی ہے اور تکبر گھمنڈ، شکستگی یا مایوسی کا شکار بن چکی ہے - کلیسیا میں مقدس لوگ پائے جاتے رہیں - ان لوگوں نے خوشی، اطمینان، فنی خوبصورتی اور علم و ہنر کے ثمرات پیدا کئے ہیں - اُنہوں نے ربنا المسیح کے پاک نام سے نسلِ انسانی کی مدد اور خدمت کی ہے اور مُردوں میں سے زندہ مسیح کے وسیلے وُہ نئی زندگی بسر کرتے ہیں - کلیسیا ہمیشہ اقلیت کی حالت میں رہی ہے - وُہ ہمیشہ مقابلہ کرتی رہی ہے، اور مقدس پولُس کے خیال کے مطابق مرتی رہی ہے اور دیکھو وُہ زندہ ہے - ہمارے خداوند کا فرمان ہمیشہ سچا ثابت ہوتا ہے - "دُنیا میں مصیبت اُٹھاتے ہو لیکن خاطر جمع رکھو میں دُنیا پر غالب آیا ہوں!"

(یُوحنا ۱۶: ۳۳)

May God in Jesus Christ pour out his abundant mercies upon you all.

Yours in Christ,
Evg. Yousaf Masih (founder)
Rev. Michael Joseph...cscentrkr@gmail.com
Evg. Joy Jacob ...adrxdesigner@gmail.com

پی - آر - بی - ایس پریس لاہور میں باہتمام مسٹر وی - ایس - کے فضل سیکرٹری ایس پی سی - کے (کرسچن نالج سوسائٹی) انارکلی لاہور چھپ کر شائع ہوئی -

And this is life eternal, that they might know you the only true God, and Jesus Christ, whom you have sent. (John 17:3)
Dear Brothers and Sisters in Christ,
We greet you in the name of our redeemer Lord Jesus Christ,
The religious situation in Pakistan is known to the world, It is the dire need of the day to provide religious plus academic education to all and especially the young generation to face future challenges. We are by God's good grace and providence, in possession of old Urdu Christian literature written by our forefathers and scholars in faith, who were giants in their respective fields and piety, who sought to strengthen the Christian Indo-Pak Church in their respective day through the means of writing theological and apologetical treatises on different religious topics from the viewpoint of Christianity, This literature unfortunately as we know is literally extinct and hard to find anywhere, But we have decided to supply this lack through the means of reprinting these books again in Hard Book format for anybody who is interested in the study and defence of the word of God, This literature is extremely useful for local pastor's and preachers of the native church for expounding the word of God to those who are committed to their care, It is equally true that we are in shortage of resources to get all of the books printed that we currently have, But we will reprint books on demand and will charge an appropriate fee to cover our basic expenses for that particular book or set of books.. For the fulfillment of this divine mission, we most urgently require your cooperation and support especially through your prayers, If in case you happen to have such literature and wish to distribute it to those shepherds in need, you can contact us directly through the mails given below, Your emotional and financial support will make this impossible task possible, We also have our book list of these old books from which you can choose for yourself which book you are looking forward to read.. May God in Jesus Christ pour out his abundant mercies upon you all.
Yours in Christ,
Evg. Yousaf Masih (founder)
Rev. Michael Joseph...cscentrkr@gmail.com
Evg. Joy Jacob ...adrxdesigner@gmail.com